سلسلۂ تصنیفات مسلم بک سوسائٹی نمبر ۱۴

ضرورتِ اِلہام

مصنفہ

خواجہ کمال الدین صاحب بانی مسلم مشن ووکنگ (انگلستان)

جس کو

مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل لاہور نے

دسمبر ۱۹۲۱ء میں شائع کیا

مطبع کریمی پریس لاہور

باہتمام میر امیر بخش مینیجر چھپی

بار اول

تعداد ایک ہزار

بلادِ غربیہ میں اسلام کا مشعل

اسلامک ریویو مجریہ ووکنگ (انگلستان) قیمت سالانہ ۸ عہ

اس کا اردو ترجمہ

اشاعت اسلام

عہ سالانہ

ایڈیٹر حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری

مسلم پبلک میں اسلامک ریویو کسی معرفت کرانے کا محتاج نہیں ہم صرف برادران اسلام کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ اس وقت اسی کے منافع پر انگلستان میں اسلامی مشن کے اخراجات بہت تک چل رہے ہیں اس کا ہر ایک خریدار اب گویا بلاد غربیہ میں اسلام کا خود متکفل ہو جاتا ہے اگر برادران ملت کوشش کر کے انگریزی رسالہ کے پانچ ہزار اور اردو کے دس ہزار خریدار پیدا کر دیں تو ان کا منافع ہمارے ووکنگ اسلامی مشن کا کفیل ہو سکتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی رسالہ کئی ہزار تک بلاد غربیہ میں مفت تقسیم ہو۔ اگر کوئی مبلغ اسلام کا شیدائی ہمیں پانچ روپے سالانہ بھیجدے تو ہم اس کی جگہ ایک انگریزی رسالہ یورپ میں مفت تقسیم کر دیں گے

کیا ملت بیضا کی اشاعت کے عاشق چند ہزار بھی ہندوستان میں نہیں؟

دوستو اٹھو! جاگو!! وقت کو غنیمت سمجھو!!! اسلامک ریویو ہی کامیاب ذریعہ اشاعت اسلام کا ثابت ہوا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس نے اپنی عزت کو یورپ میں نہایت آب و تاب سے قائم کیا ہے اسکو مضبوط کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل پاؤ گے والسلام

المشتہر خواجہ عبد الغنی ۔ اسلامک ریویو و اشاعت اسلام عزیز منزل لاہور

فہرست مضامین ضرورت الہام

مضمون	نمبر صفحہ
مذہب پھیلائیں۔ چار انجیلوں کو پڑھ لیں۔ تثلیث کا نام تک ان میں نہ پاؤگے۔ انجیل یوحنا میں ایک آیت ہے۔ جس میں باپ بیٹا روح القدس کا ذکر ہے۔ یہ آیت بھی الحاقی ہے اور پرانے نسخوں میں موجود نہیں + قرآن کے سوا آج کونسی کتاب ہے جسے انسانی ہاتھ نے تباہ نہیں کیا۔ اس کتاب کو خداوند تعالے نے انسان کی فلاح وہدایت کے لئے نازل فرما کر یہ خوشخبری دی۔ الیوم الملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً ط	

انتساب

بعض وقت مصنف اپنی کتاب کو کسی بزرگ کے نام پر معنون کر دیا کرتے ہیں۔ اس نسبت کے لئے خاص وجوہ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کسی دوست کی محبت و شفقت اور توجہ کے شکر یہ میں میں یہ چاہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اُس کے حق میں دعاء خیر کریں۔ جنھوں نے میرے قیام سنگاپور کو میرے لئے قیام وطن مالوف کر دیا۔ اور اپنی ان تھک کوششوں سے نہ صرف میری راحت و آسائش کے پورا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا بلکہ میرے سفر کو بھی ایک کامیاب سفر کیا۔ تو میں ان اوراق کو

جناب حکیم حافظ کریم بخش صاحب سلمہٗ

کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔ خداتعالےٰ انھیں ہر قسم کی مکروہات زمانہ سے محفوظ رکھے۔ اور ان کا خاتمہ بالخیر کرے +

سنگاپور۔ مکان محمد غوث صاحب ماربکار } خواجہ کمال الدین

مورخہ ۹ فروری سنہ ۱۹۲۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انٹروڈکشن

خوشی کا مقام ہے کہ انگریزی خوان طبقہ میں مذہبی شغف پیدا ہونے لگا ہے۔ نوجوان مسلم احباب سمجھنے لگ گئے ہیں۔ کہ جو قرآن ایک وقت ان کے اجدادِ اوّلین کی عزّت و شرف کا موجب ہو چکا ہے وہی انہیں موجودہ قعرِ ذلت سے نکالکر مطلوبہ معراج تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ امر صحیح ہے کہ قرآن چھوڑ کر ہم نے سب کچھ گنوایا۔ اور قرآن سے ہی تمسّک کر کے ہم گئی گذری عزّت کو واپس لے سکتے ہیں امام وقت نے بالکل صحیح فرمایا ؎

مفقود شدہ است درسِ قرآں

زاں روز ہجوم ایں بلا ہست

بحمد اللہ پھر مسلمانوں کی اٹھتی نسل حقیقی چشمہ ہدایت کی طرف آنے لگی اس نئے انتشارِ روحانی نے میری قلم کو بھی تحریک دی۔ اور میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں ان عزیزانِ قومی کی امداد فہم قرآنی کیلئے چند کتابیں لکھدوں +

قرآن کریم کو ہم الہامی کتاب مانتے ہیں اور اسکے الہام کو وحیٔ متلو تسلیم کرتے ہیں یادیت دہ طوائع نے نفسِ الہام پر اور اسکے بعد پھر ضرورتِ الہامِ قرآن پر طرح طرح کے اعتراض تراشے ہیں۔ اور مسلم متکلمین کا یہ فرض ہے کہ وہ معقول

طریق پر ان اعتراضات کا دفعیہ کریں۔ یہ اعتراضات مختلف شکلوں میں مختلف جوانب سے ہو رہے ہیں۔ مثلاً خدا کی طرف سے انسان کو الہام کی کیا ضرورت ہے۔ الہام کیا چیز ہے۔ اگر الہام کوئی چیز ہے تو وہ انسان کے اندر خود بخود پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا کو کیا ضرورت ہے کہ وہ بولے۔ پھر کیا ضروری ہو کہ کل دنیا کیلئے ایک ہی الہام ہو۔ قرآن سے پہلے بہت سی الہامی کتابیں دنیا میں موجود تھیں اس صورت میں قرآن کی کونسی ضرورت تھی۔ الغرض مختلف نوعیت کے اعتراضات الہام کے متعلق ہوتے ہیں میں نے کوشش کی ہے۔ کہ ان سب باتوں کا جواب برنگ معقولیت بربناء تعلیم قرآنی اس کتاب میں آجائے۔ وما توفیقی الا باللہ +

اس زمانہ میں ہمارے معتقدات صرف نتیجہ منقولات نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ہمارے ایمانیات کی بنیاد حکمت و عقل پر ہونی چاہئیے میں نے اپنی تحریرات میں کم از کم ہمیشہ اسی امر کو سامنے رکھا ہے اس کتاب کے پڑھنے پر اگر الہام کے متعلق کوئی مزید اعتراض کسی کے دل میں پیدا ہو یا تعلیم قرآن پر کسی نہج میں کسی کو کوئی شبہ ہو تو مجھے اس سے واقف کیا جائے۔ ممکن ہو کہ میں جواب دے سکوں۔ یوں تو یہ باتیں ہمیشہ میرے سامنے رہی ہیں لیکن انہیں موجودہ تحرک کا موجب میرے مکرم دوست اسمٰعیل ابراہانی بی۔ اے ہوئے۔ خدا تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ قوم میمن میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو دائرہ تجارت میں گھرے رہنے کے علاوہ قومی علمی مذہبی امور میں بھی ابراہانی صاحب کی طرح دلچسپی رکھتے ہوں +

سنگاپور مورخہ ۳ فروری ۱۹۲۱ء

خواجہ کمال الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

ضرورتِ الہام

تہذیبِ انسان کیا چیز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ والشمس وضحٰھا ۔ والقمر اذا تلٰھا ۔ والنھار اذا جلّٰھا ۔ واللیل اذا یغشٰھا ۔ والسمآء وما بنٰھا ۔ والارض وما طحٰھا ۔ ونفسٍ وما سوّٰھا ۔ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ۔ قد افلح من زکّٰھا ۔ وقد خاب من دسّٰھا ۔ ترجمہ ۔ سورج اور اس کا نکلنا چاند اور اس کا سورج سے روشنی لینا ۔ دن اور اس کا روشن ہونا ۔ رات اور اُس کا پردہ (ظلمت) آسمان اور اس کی بناوٹ ۔ زمین اور اُس کا پھیلاؤ ۔ نفسِ انسانی اور اسکی تعدیل وتکمیل شدہ حالت ۔ یہ سب کی

سب شاہد ہیں ان کی شہادت پر غور کرو۔ اور اس مقصد پر غور کرو جس کیلئے ایک **ذات** نے انہیں بنایا ہے اس طریق پر بھی غور کرو۔ جس پر چلکر یہ سب کے سب اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اسی امر کو اس **ذات** نے سامنے رکھا پھر اس نے نفس کو گمراہی اور اس سے بچنے کا الہامی علم دیدیا۔ پھر جس نے تزکیہ کیا۔ اسی کے قویٰ نشو و نما پا گئے۔ اور وہ کامیاب ہو گیا۔ جس نے اپنے قویٰ کو دبا ڈالا۔ وہ ناکامیاب رہا +

یہ قرآن کی آیات ہیں یا کان **حکمت** سے نکلے ہوئے جواہرات کے ٹکڑے۔ ایک طرف اگر یہ حقائق علمیہ کی جان ہیں۔ تو دوسری طرف فلسفہ و منطق کی روح رواں کہیں سے قرآن کھولکر دیکھ لو۔ اس کا یہی رنگ ہے جس بات کو یہ منوانا چاہتا ہے۔ اُسے تحکمانہ طور سے پیش نہیں کرتا بلکہ دلائل سے منواتا ہے۔ اسی طرح جس بات کو توڑتا ہے

لے قسم کی غرض شہادت ہوتی ہے۔ جس واقعہ کا علم سوائے ہمارے اور کسی کو نہ ہو تو ہم خدا حاضر و ناظر کو قسم سے یاد کر کے اس واقعہ کا یقین دوسروں کو دلانا چاہتے ہیں۔ جس سے ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خدا ہمارا گواہ ہے۔ بلکہ بعض وقت فقرہ خدا کی قسم کی بجائے "خدا شاہد ہے" "خدا جانتا ہے" کہدیا جاتا ہے۔ جس سے حقیقت قسم منکشف ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کا قرآن میں مظاہر قدرت کی قسم کھانا ان کو بطور شاہد پیش کرنا ہے +

دلائل سے توڑتا ہے قد صدق واﷲ تعالیٰ لیہلک من ھلک عن بینۃ۔ ویحییٰ من حی عن بینۃ (جس چیز کا کھنڈن ہوگا وہ دلائل سے ہوگا۔ اور جس چیز کا منڈن ہوگا وہ دلائل سے ہوگا) اور دلائل بھی کوئی پیچیدہ نہیں بلکہ ہر بات کا صحیفۂ قدرت سے استدلال کیا جاتا ہے امورِ نظریہ کو عمل میں لائی ہوئی نیچر کی چیزوں سے روشن کردیا جاتا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنے قول کے ثبوت میں اپنے فعل کو بطور شہادت پیش کردیتا ہے جس طرح مقدس ادبیات میں یہ بات قرآن سے ہی مختص ہے کہ اس کی ہر ایک تعلیم اپنے ساتھ دلائل لئے ہوئے ہے اور یہ بات کسی مشہور الہامی کتاب میں نہیں اسیطرح عالمِ استدلال و استنباط میں حقائق کو منوانے کے لئے صحیفۂ کائنات کو پیش کرنا بھی قرآن ہی کی شان ہے صدیوں بعد اگر کسی نے یہ پیرایہ اختیار کیا تو اسی کی تقلید میں کیا +

یہاں بیان تو یہ کرنا مقصود تھا کہ انسان کو الہام کی ضرورت ہے لیکن اس امر کو مبرہن کرنیکے لئے ان تمام مناظر قدرت کو گن ڈالا ہے۔ جن کے وجود سے اور جن کی مقررہ راہوں پر چلنے سے نفس انسانی پیدا ہوتا ہے

پھر اسکی تکمیل کی طرف اشارہ کرکے یہ دکھلایا گیا ہے
کہ اگر نفس انسانی تکمیل نہ پائے تو یہ سارے کا سارا
نظام قدرت اکارت جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی اشارہ
کردیا۔ کہ جس طریق پر یہ نظام صحیح نتائج پیدا کرتا ہے
تکمیل نفس اسی راہ پر قدم مارنے سے ہوتا ہے +
اس اجمال کی کیفیت سمجھنے کیلئے سب سے اول ہمیں
یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ نفس انسانی کی پیدائش میں ان اشیاء
مندرجہ آیات بالا کو کیا تعلق ہے۔ سو یہ سمجھ لینا چاہیئے
کہ نفس انسانی یعنی نفس مُدرکہ اگر نطفہ انسانی میں مخفی
ہے۔ تو اس نطفہ کو پیدا کرنیوالی زمین کی روئیدگیاں
ہیں (والارض وما طحٰھا) آسمان سے پانی اُترتا ہے۔ جو
ہر قسم کی نباتات کیلئے حیات کا کام دیتا ہے لیکن اس
سارے نظام کی کل چلانیوالا آفتاب ہی ہے۔ اسکے
نکلنے سے سوئی ہوئی نیچر جاگ کر اپنے اپنے مفوضہ کاموں
میں لگ جاتی ہے۔ اس کی تمازت اختلاف لیل و نہار
کے باعث تبدیلی موسم کردیتی ہے۔ جس سے ہوا چلکر
آسمان پر بادل جمع کرلیتی ہے۔ ان سے پانی اُترکر
زمین میں آجاتا ہے۔ پھر دن کی روشنی درختوں کی خوراک
کو پانی سے کاربونک ایسڈ گیس اور ایسی ہی مختلف زمین

کے ذخیروں سے نکالتی ہے جسمیں آسمان سے اترا ہوا پانی ہی مدد کرتا ہے۔ رات آن کو درختوں کے ان غذاؤں کے جذب کرنے کیلئے ظلمت پیدا کر دیتی ہے دوسری طرف چاند کی روشنی پھلوں کو پکا کر اُن میں خوش ذائقی پیدا کر دیتی ہے۔ الغرض سورج۔ چاند۔ رات۔ دن آسمان زمین کا بالترتیب ذکر بطور شہادت قرآن نے آیات بالا میں کیا ہے۔ ... سب بلکہ مختلف قسم کے پھل پھول نباتات پیدا کرتے ہیں۔ ان میں زمین ... کی کل قوتیں اور اس کے اندر کے کل مدفونہ جوہر و عنصر کشیدہ ہو کر آجاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ان کا نام سلالۃ طین رکھا ہے۔ جسم کی پرورش اور نطفہ کی پیدائش کیلئے چند چیزیں ضروری بنائی گئی ہیں۔ مثلاً نشاستہ شکر۔ مائعات۔ حموضات۔ پروٹین (لحمیت) فاسفورس دہنیت یہی وہ سلالۃ طین ہیں۔ جن سے نطفہ بنتا ہے اس نطفہ میں نفس انسانی چھپا ہوا ہوتا ہے ÷

اب اگر اس سارے نظام کی غرض و غایت صرف پیدائش نفس انسانی ہی تھی جس کے آگے کوئی منزل ارتقاء نہ تھی۔ تو پھر یہ غرض تو حیوانات میں بھی حاصل

ہو چکی ہے۔ کیونکہ یہی زمینی روئیدگیاں ہر جانور کی
خوراک بن کر نطفۂ حیوانی پیدا کر دیتی ہیں۔ انسان
کی طرح ہر ایک حیوان میں اِدراک موجود ہے۔ لیکن
مدرکۂ حیوانی اور مدرکۂ انسانی میں جسے قرآن نے لفظ
نفس سے تعبیر کیا ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔
ان میں سے ایک میں اگر سلجھاؤ کی استعداد ہے
تو دوسرا کسی تادیب کے نیچے نہیں آتا۔ یہ نظارہ ہمیں
اس نتیجہ پر لے آتا ہے۔ کہ جس نفسِ انسانی کو ان
مظاہرِ قدرت مندرجہ آیات بالا نے ملکر پیدا کیا ہے
اور جو اپنی پہلی منزل پر مدرکۂ حیوانی سے ملتا جلتا
ہے۔ وہ اپنے آگے اور بہت سے منازل ترقی
بھی رکھتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان تہذیب کامل
پا لیتا ہے۔ اس لئے قرآن نے فرمایا ہے۔ و
نفس وما سوّٰیھا۔ یعنے جب نفس تعدیل و تکمیل
پا جائے۔ گویا اسکی حالت پیدائش ہی اسکی آخری حالت
نہیں۔ بلکہ اس کے کمال کی حالت یہ ہے کہ وہ سورج
اور چاند اور رات اور دن آسمان اور زمین کی طرح کام
کرے۔ اگر سورج کی طرح نکل کر یہ سوئی ہوئی دُنیا کو
جگا دے۔ اور غفلت زدہ انسانوں کو اپنے کام پر لگا کر

اُنکی بیکار قوتوں کو ٹھکانے لگا دے ۔ جیسے کہ اِنسان کامل دنیا میں آکر کرتے ہیں ۔ چاند کی طرح نور ہدایت آسمان سے پاکر دوسروں کی پختگیٔ عقل اور صلاحیتِ مزاج کا موجب ہوجائے ۔ دِن کی طرح اگر یہ اَوروں کے سامنے مختلف کاروبار کے راستے کھولدے ۔ تو رات کی طرح اُن کیلئے چادرِ رحمت کھول کر اُن کی استراحت کا مُوجب ہو جائے ۔ آسمان سے اُترے ہوئے پانی کی طرح یہ دوسروں کے کشت لیئے باران رحمت بن کر اپنے اثرات کو مردہ طبائع پر ڈالتا ڈالتا فطرتِ اِنسانی کے مدفونہ جوہروں کو کام میں لے آئے یہ اس نفس انسانی کی حالت ہوتی ہے ۔ جو سورج چاند رات دن اور دیگر مظاہر قدرت کی طرح مفروضہ راہوں پر چلکر سب سے اول خود اپنے اندر صلاحیتیں پیدا کر لیتا ہے ۔ جس امر کا اشارہ مذکورہ بالا لفظ سوّٰىهَا میں موجود ہے یعنی وہ نفس جو کامل ہوگیا ۔ اسی سوّٰىهَا[لہ]

لہ عربی زبان میں یہ عجیب خوبی ہے کہ جہاں اس کا ہر لفظ بہت سے معانی و مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے ۔ وہاں بعض دفعہ ایک لفظ کے دو معنے وضع کیے گئے ہیں جنمیں علت و معلول یا سبب و نتیجہ کا تعلق ہوتا ہے ایک معنے اگر کسی مقصد کا مفہوم دیتے ہیں تو اس کے دوسرے معنی ان اسباب کا

کی حالت کا نام تہذیبِ انسانی ہے۔ لفظ سوّٰیھا اپنے
مصدری معنوں میں تعدیل اور تکمیل دونوں مفہوم ظاہر کرتا ہے
اس سے مراد یہ ہے کہ نفس کا کمال اسے تعدیل کے نیچے لانے
سے پیدا ہوتا ہے۔ اسمیں جو جوہر ہیں وہ اسی وقت پنپتے ہیں
جب اُنکی ناتراشیدہ حالت کی اصلاح کیجائے جس کے لئے
ہدایت اور راستہ کی ضرورت ہے۔

بقیہ حاشیہ

مفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ جن سے وہ امر حاصل ہو سکتا ہے مثلاً اسی لفظ سوّٰی
کے ایک معنی اگر تکمیل شئے ہے تو دوسرے معنی تسویہ یعنی تعدیل کے
ہیں یعنی کسی چیز کی تکمیل اس کے اجزا کی تعدیل لانے سے ہو جاتی
ہے۔ اسی قسم کا ایک لفظ تقویٰ بھی ہے۔ اس کے معنے اگر نیکی ہے تو
بچنے کے بھی ہیں یعنی نیک بننے کا گُر بچنا ہے۔ فلح کے ایک معنے
کامیابی یا پھلنا پھولنا ہیں۔ اس کے دوسرے معنے کھود کر کسی چیز
کو باہر نکال دینا ہے جس سے مُراد یہ ہے کہ کسی چیز کو کھودنے اور
کُریدنے سے ہی اس کے جوہر باہر آتے ہیں جسمیں اسکی اصلاح کامیابی ہوتی
ہے۔ اسیطرح تزکیہ یا اس کے مصدر زکاء کے ایک معنی پاک ہونا یا آگ میں جانا
ہے تو دوسرے معنے پھولنے یا بڑھنے کے ہیں۔ یہ دونوں معنے ہی قسمیں سبب
اور نتیجہ کا رشتہ ظاہر کرتے ہیں۔ اسیطرح امن اور لفظ اسلام ہیں۔ ایک طرف
ان کے معنے ماننا تسلیم کر لینا ہیں۔ اور دوسری طرف امن اور سلامتی کے ہیں

نفس انسانی نفس حیوانی ہے

انسان اور حیوان کا جسم ایک ہی اجزا سے مرتب ہوا ہے لیکن جس سے اختلاف شکل و مزاج پیدا ہوتا ہے وہ اختلاف مقدار اجزا ہے۔ یعنے ہر جانور کے جسم میں اور ایسا ہی جسم انسان میں اجزاء تو وہی ہیں لیکن مختلف جانوروں کے جسم میں یہ اجزاء مختلف مقدار میں ترکیب پائے ہیں گائے اور اونٹ جسم میں ایک ہی قسم کے عناصر سے پیدا ہوئے ہیں لیکن ان دونوں کے جسم کی ترکیب میں اختلاف مقدار و اجزا نے نہ صرف دو مختلف شکلیں ہی پیدا کردی ہیں۔ بلکہ دو مختلف گوشت پوست خون دل دماغ بھی پیدا کئے ہیں۔ جس نے اونٹ کے نفس مدرکہ اور گائے کے مدرکہ میں اختلاف عظیم پیدا کر رکھا ہے۔ اسی طرح ان مختلف جانوروں کے جذبات میں بھی فرق بین ہے شتر گر کینہ کا مجموعہ ہے۔ تو گائے

بقیہ حاشیہ

وہ مخصوص ہوا من اور سلامتی اسی صورت میں رہ سکتی ہے جب ایک شخص کچھ کہے اور دوسرا مان لے۔ صدہا اس قسم کے اور بھی الفاظ ہیں لیکن میں نے یہاں ان چند الفاظ کو لکھا ہے جو اس کتاب میں زیر بحث ہونگے +

اپنے انکسار اور غریب مزاجی ہیں اور جانوروں سے بڑھی ہوئی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جہاں انسان اور دیگر حیوانات کے اجسام کے اجزاے مرکّبہ بالکل ایک ہی ہیں۔ وہاں ان اجزاء کے اختلاف تعداد نے مختلف شکلیں مختلف ہوئے مختلف گوشت مختلف خیالات دماغ اور اسلئے نتیجتاً مختلف مدرکات و جذبات بنادیئے ہیں۔ انسان میں یہ سب اجزاء ایک خاص انداز پر جمع کئے گئے ہیں۔ جس کا نام قرآن نے احسن تقویم رکھا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ دوسرے حیوان تو فرداً فرداً بعض جذبات کو اپنے اندر بدرجۂ اتم رکھتے ہیں۔ اور بعض جذبات کا ان میں نام تک نہیں ہوتا مثلاً کتّے میں جذبہ اخوت مطلق نہیں ہوتا۔ ایک کتا دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا بالمقابل مدرکۂ انسانی نے کُل کے کل جانوروں کے جذبات اپنے اندر ایک خاص اعتدال پر جمع کر لیئے ہیں۔ اسی طرح حیوانات کے جذبات کسی تادیب اور تہذیب کے نیچے نہیں آتے۔ نہ ان کی طبیعت میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے جذبات تادیب اور تہذیب تلے آسکتے ہیں۔ ان میں کمی بیشی یا تعدیل کی استعداد ہوتی ہے۔ مثلاً بھیڑیا یا شیر کسی حالت

ہیں درندگی نہیں چھوڑ سکتا۔ سؤر بیحیائی و دیوثی اور رغبت نجاست کو اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکتا اسی طرح بندر۔ کتا۔ مرغ۔ خرگوش وغیرہ اپنے اپنے اندر بعض جذبات کو کامل صورت میں رکھتے ہیں جنہیں کمی بیشی واقع نہیں ہو سکتی۔ ان جانوروں کے مدرکات گویا جمود کی حالت میں رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے بعض ترقی بھی کرتے ہیں۔ تو ان کا دائرہ ترقی بھی محدود ہوتا ہے۔ بالمقابل مدرکۂ انسانی تو مناسب ہدایت و علم کی رہنموئی میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ زمین پر بیٹھ کر مشتری عطارد اور افلاک ہفتم کی سیر کرتا ہے۔ تو نور ہدایت پا کر غیب کے سب اسرار پڑھ لیتا ہے۔ اس حیوانی انسانی اختلاف کا باعث جیسے میں نے اوپر بیان کیا ہے اختلاف ترکیب و مقدار اجزاء جسم ہے جس سے مختلف جانوروں کے جسم میں مختلف کیفیات سے گوشت اور ان کے گوشتوں میں مختلف جذبات پنہاں ہو جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے جسم میں اگر یہ اجزاء کسی اعتدال پر جمع ہوئے ہیں تو جس جانور کا گوشت انسان کھائیگا۔ اس کے اجزاء کے مقدار کو اپنے جسم میں بڑھائیگا جس سے ان جانوروں کے

اخلاق و جذبات اسمیں منتقل ہو جائینگے - اس لئے شریعت
اسلام نے بعض گوشت ہم پر حرام کر دیئے ہیں - اِس حقیقت
پر کہ انسانی جسم میں جانور موجود ہیں - آج علمی تحقیق
نے مُہر لگا دی ہے - بعض وقت بیماروں کے قطرات
خون جب خوردبینی مُعائنہ میں آتے ہیں - تو ان قطرات
میں مختلف جانوروں کی شکلیں نظر آتی ہیں - ہاتھی گھوڑا
کتا سور سوڑ ایک چھوٹی سی شکل میں خون کے اندر رینگتے
نظر آتے ہیں - کیا یہ تحقیق اس طرف اشارہ نہیں کرتی
کہ ان جانوروں کی طبیعت ہی انسانی طبیعت میں
موجود ہوتی ہے - اس طبّی معائنہ سے یہ تو ظاہر ہے - کہ
انسان کے جسم میں مختلف جانور چھوٹی چھوٹی مقدار میں
موجود ہیں - لہٰذا یہ امر ظاہر ہے کہ اگر کسی جانور کا گوشت ہم
کھائیں گے تو وہی جانور ہمارے اندر پرورش پاکر اپنی
مزاج کو ہماری طبیعت کر دیگا +

اس ساری بحث سے مقصود یہ تھا - کہ جسم انسان
کے اجزاء مرکبہ نے ایک احسن تقویم میں ترکیب پائی ہے اس کے
ماتحت اس کی فطرت میں کل کے کل جذبات حیوانی برنگ اعتدال
جمع ہو چکے ہیں - وہ تہذیب و تادیب پا کر کہیں سے کہیں
پہنچ سکتے ہیں - لیکن اگر ان کی تربیت کا فکر نہ کیا جائے تو پھر

حالات مختلف اس کے اندر کسی جانور کے جذبات کو ہیجان کر کے اُسے وہ جانور بشکل انسان بنا دیتے - مثلاً انسان کے اندر کتا - بلا - سؤر سب موجود ہیں - اگر نفس انسانی صحیح تربیت پائے تو یہ سب کے سب اپنے اپنے مناسب محل اور موقعہ پر اپنے کام دیں گے - آخر کتا - بلا - سؤر سب کے سب اپنے اپنے مقام پر ایک صحیح مقصد کو پورا کرتے ہیں - اور ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو حکمت الٰہیہ نے بیکار پیدا کی - یہ سب کے سب کائنات کے اجزا ضروریہ ہیں اور اپنا اپنا مفوضہ کام دے رہے ہیں جسم انسان بھی ایک چھوٹی دُنیا ہے - اسکے اندر بھی کائنات کے کل کے کل کارنامے عمل میں آتے ہیں جو وہاں بر رنگ جسمانیات ہو رہا ہے - یہاں ادراک و تعقل کے جامہ میں ہوتا ہے - اسلئے نفس انسانی میں ان جانوروں سے مُدرکات جمع کر دیئے ہیں - کہ اپنا اپنا کام مناسب محل و موقع پر ادا کریں - اسلئے اسبات کی بڑی ضرورت ہے - کہ انسان صحیح راہ پر چلکر ان مُدرکات مختلفہ کو کسی ٹھکانے پر لے آئے - یہی اس کی تہذیب ہے لیکن اگر نفس انسانی تعدیل مناسب کے ماتحت نہ آئے - تو پھر کسی خاص جانور یا زیادہ جانوروں کے جذبات اسکی طبیعت میں غالب آ کر اسے

کُتّا ۔ بِلّا یا سُؤر یا کوئی اَور جانور بنا سکتے ہیں ۔ یہ کوئی وہمی باتیں نہیں بلکہ حقائق زندگی ہیں ۔ اگر نظر بصیرت سے کوئی انہیں دیکھے ۔ ہمنے اپنی زندگی میں ایسے انسان دیکھے ہیں ۔ جن کا جسم جانوروں کا چڑیا خانہ ہوتا ہے مثلاً بعض انسانوں کا جسم ایک ہی وقت سُؤر ۔ کُتا ۔ بلی کا پنجرہ ہوتا ہے ۔ وہ سُؤر کی طرح بیحیائی ۔ دیوثی اور نجس خوری کی عادت کے ساتھ بلی کی طرح حد درجہ کے صفائی پسند ہیں لیکن کتے کی طرح جس چیز پر قبضہ پالیں اسکی طرف کسی اَور کو آنے نہیں دیتے ۔ کائنات میں یہ تینوں جانور الگ الگ رہتے ہیں ۔ بلکہ کُتّا اور بلی ایکدوسرے کے دشمن ہیں لیکن جس طریق پر بعض انسان اپنے گھروں میں کُتا ۔ بلی جیسے دو دشمنوں کو پال سکتے ہیں اسی طرح ان کی فطرت کا پنجرہ ان تین جانوروں کو اکٹھے جمع کر سکتا ہے ۔ قرآن نے یہودیوں کے متعلق اگر کونوا قردۃ خاسئین کہا ہے تو اس کی بھی یہی حقیقت ہے ۔ نفس انسان کے دو متضاد رنگوں کی طرف قرآن نے ذیل کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین یعنے انسان کے جذبات بہتر سے بہتر

شکل میں اور ادنے سے ادنے صورت میں متشکل ہو سکتے ہیں۔ وہ فرشتہ چھوٹ اس سے بھی بلند مقام پر جا سکتا ہے لیکن تنزل کرنے لگے۔ تو حیوان کیا حیوانون سے بدتر ہو جاتا ہے۔ کالانعام بل ھم اضل انسان کی ہی شان میں آیا ہے۔ مثلاً ہر ایک جانور کو اپنے جوڑہ سے ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ جس کے متعلق ان کی غیرتیں مختلف انداز پر واقع ہوئی ہیں۔ ایک مرغ اپنے پیروں کے نیچے لائی ہوئی مرغیوں کے پاس تک کسی دوسرے مرغ کو پھٹکنے تک نہیں دیتا۔ ایک ہاتھی اپنی رفیقہ کے ساتھ مخلع بالطبع ہونے ہوئے کسی کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اسمعاملہ میں انسان کی طرح نہایت ہی تنہا پسند واقع ہوا ہے۔ ان دونوں کے بالکل اُلٹ سُور اور کتا واقع ہوئے ہیں۔ مرغ کی طبیعت کے برخلاف سُور کے سامنے اگر اس کے جوڑہ پر کوئی دوسرا سُور قابو پالے تو اُسے پروا تک نہیں ہوتی۔ ہاتھی کی عادت کے خلاف کتے کتیاں سربازار جمع ہوتے ہیں۔ پھر کُل حیوانات میں سُور کو ہی یہ امتیاز حاصل ہے۔ کہ وہ ہیجان جذبات پر خلاف وضع فطری راہونکو اختیار کر لیتا ہے۔ یہ چاروں قسم کے جانور یعنی مرغ۔ ہاتھی۔ کتا

محصور رہیں نسل انسانی میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ حسب تعلیم قرآن
ان سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ مثلاً سؤر کی بےغیرتی صرف
اسی قدر ہے۔ کہ وہ اپنے جوڑہ کے کہیں اور چلے
جانے کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن سؤر بشکل انسان کسی
تھوڑی سی ضرورت کے لئے اپنے متحرمات کو خود
دوسروں کے آگے پیش کر دیتا ہے ؏

خلاف وضع فطری فعل نہایت ہی قبیح اور شنیع امر
ہے۔ اور بدقسمتی سے ہر جگہ کم و بیش حالت میں موجود ہے۔
لیکن اس امر پر اصرار اور اسکو قانوناً جائز ٹھیرانے کی تحریک
ہم نے صرف جرمنی کے ایک طبقہ حکماء میں پائی گویا سؤر
اپنے کامل رنگ میں وہاں موجود ہو گیا۔ چنانچہ انکی خوراک
میں بھی وہ چیزیں آ جاتی ہیں۔ جس پر اور اقوام یورپ
بھی ہمت نہیں مارتیں۔ مزید مطالعہ پر اور بہت سے
جانور انسانی لباس پہنے ہوئے نظر آ سکتے ہیں۔ چونکہ
اس زندگی پر ہی انسانی ترقی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ اسلئے
جب ایسے انسان مر جاتے ہیں۔ تو ان کا حشر بھی آیندہ
قالب انسانی میں اسی جانور کے اخلاق سے ہوتا ہے
اگر ایک انسان مرتے دم تک سؤر یا کتا رہا تو ضرور ہے کہ
اس کا حشر بھی کتے اور سؤر کا ہوگا۔ ہاں اگر یہاں جسم انسانی

میں ایک کتّا یا سؤر کی روح کام کرسکتی ہے۔ تو پھر اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ آیندہ زندگی کا کتّا یا سؤر بھی انسانی شکل میں آئے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ جانور اپنی شکل میں ہی آجائیں۔ اس راز کے نہ سمجھنے نے ہندوؤں میں مسئلہ تناسخ پیدا کردیا ہے ✦

اب وہ کونسی راہیں ہیں جن پر چلکر انسان حیوانات سے بچ جائے۔ اور اس مقام اعلےٰ پر پہنچ جائے جب جنگل کے کُل جانور اُس کے قابُو میں آجائیں۔ وہ چڑیا خانہ کا جانور نہ بنے۔ بلکہ چڑیا خانہ کا منتظم ہو۔ وہ اصطبل میں خچر۔ گھوڑا۔ اونٹ یا ہاتھی ہونے کی بجائے داروغہ اصطبل بنے۔ اور حسب ضرورت ان سب سے کام لے۔ اسی کا نام

تہذیب نفس

ہے۔ ایسا ہی اسے ان غلط کاریوں کا علم ہونا چاہیئے جن سے نہ بچنے پر انسان اپنی فطرت کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور انسان ہونے کے بجائے حیوان سے بھی بعض وقت بدتر ہوجاتا ہے عام فہم زبان میں یہ کہنا چاہیئے۔ کہ انسان کو بدیوں کا اور ان سے بچنے کا علم ہونا چاہیئے۔ ایسا ہی اُسے وہ راہیں معلوم ہوجائیں۔ کہ جن پر وہ قدم مارے۔ غلط اور صحیح میں تمیز کی استعداد قوا انسان میں موجود ہے۔ ہاں اُسے

اس ہدایت کی احتیاج ہے۔ جس سے وہ استعداد فعل میں آجائے۔ سوال اب یہ ہے۔ کہ آیا یہ علم و ہدایت اسکی فطرت میں از خود موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اسے کسی خارجی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ اگر موجود نہیں تو پھر وہ اسی امر کا محتاج ہے۔ جسے الھام کہتے ہیں۔ لہٰذا جبتک اسے یہ علم حاصل نہ ہوگا۔ وہ مقصد پیدائش کو پورا نہیں کر سکتا۔ اور کُل کا کُل نظام مندرجہ آیات زیر بحث یعنے سورج چاند دن رات آسمان جنہوں نے ملکر اسے پیدا کیا تھا۔ وہ سب کا سب اکارت جاتا ہے۔ اسلئے قرآن نے ان مظاہر قدرت کا آیات بالا میں ذکر کر کے اخیر میں یہ کہا۔ فالھمھا فجورھا و تقوٰیھا۔ اللہ تعالےٰ نے بذریعہ الہام انسان کو خیر و شر کا علم دیدیا ہے۔ اُسے سمجھا دیا گیا ہے۔ کہ راہ سے ادھر اُدھر ہونے کا نام فجور ہے۔ اور اگر بھٹکنے سے بچ جائے۔ تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اور اس آیات میں یہ بات قابل غور ہے۔ کہ اسکو حرف ف سے شروع کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے قرآن نے سورج چاند وغیرہ کا ذکر کیا۔ پھر نفس انسانی کا ذکر کیا جو ان سے پیدا ہوا۔ پھر اسکی بلند استعداد کیطرف بھی اشارہ کیا پھر فالھمھا

فجورھا وتقویٰھا کو حرف ف سے اسلئے شروع کیا۔ کہ اگر ایسا الہام نہ آئے۔ جو غلط اور صحیح راہ دونوں کا الگ الگ علم انسان کو قدم اٹھانے سے پیشتر دیدے۔ تو یہ سارا نظام بے سُود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا فرماکر الہام پر چلنے یا نہ چلنے کا نتیجہ بتلا گیا ہے۔ یعنے انسان کے اندر جو مخفی استعدادیں ہیں۔ وہ تقویٰ کی راہوں پر چلنے سے مثمر ہو ہی جائیں گی۔ اسی کا نام تہذیب انسانی ہے۔ اور اگر انسان نے اُلٹی راہ اختیار کی۔ تو وہ قوتیں دب جائیں گی۔ قرآن ایک اور موقع پر یہ کہتا ہے کہ دو قسم کی راہیں خُدا تعالیٰ نے انسان کو بتلا دی ہیں جیسے کہ فرمایا۔ وھدینٰہ النجدین۔ ہم نے دونوں راستے اُسے بتلا دیئے ہیں +

لیکن ہم نے یہ دیکھنا ہے۔ کہ آیا انسان خدا کیطرف سے کسی رہنموئی کا محتاج بھی ہے یا نہیں یا اسکی فطرت میں ہی غلطی سے بچنے کی استعداد موجود ہے جیسے کہ برھمو لوگ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ انسان کے اندر جو کانشنس ہے اسکی موجودگی میں اسے کسی خارجی الہام کی ضرورت نہیں۔ لیکن کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کانشنس ہمارے اندر ہی اندر موجود ہو +

امور بالا پر غور کرنے سے یہ امر بھی طے ہو جاتا ہے۔ کہ عمدہ خوراک لباس یا مکان اور ایسا ہی آسائش کے پیمانوں کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دینا تہذیب نفس سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ یوں کہو کہ مادیات کو تہذیب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک حد تک تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انسان نے غلطی سے انہیں تہذیب کا نام سونپا ہے۔ ہم موسم سرما میں ایرانی بلی یا سنجاب و سمور جیسے جانوروں سے بہتر لباس اپنے لئے مہیا نہیں کر سکتے۔ ہم خوبصورتی لباس میں مور یا تیتری سے سبقت نہیں لیجا سکتے۔ اب یہ باتیں کسی خاص صفت سے ان جانوروں کو حاصل نہیں ہوئیں۔ جن اجزاء و عناصر سے ہمارا جسم مرتب ہوا ہے۔ وہی ان مذکورہ بالا جانوروں کے جسم کو پیدا کرتی ہیں۔ لیکن ان کے جسم میں اختلاف مقدار اجزاء نے ایرانی بلی اور سنجاب پر یہ خوبصورت کھال پیدا کر دی ہے۔ دوسری طرف اسی اختلاف سے تیتری نے ایسا زرق برق لباس پہنا۔ اگر خالق فطرت کے نزدیک انسانی کمال اور اسکی تہذیب اچھے کپڑوں سے تعلق رکھتی۔ تو پھر کونسا مشکل امر تھا۔ اسی مقدار پر عناصر ہمارے جسم میں رکھ دیئے

جاتے لیکن اس وقت ہم بلّی یا مور ہوتے اِنسان نہ ہوتے یہی حال خوراکوں اور مکانوں کا ہے۔ بقول مسیح ایک چڑیا تک آسانی سے اپنا رزق اور ٹھکانا حاصل کر لیتی ہے لہٰذا انسان کو اور خصوصاً ہم میں سے مادیت زدہ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہئے۔ کہ خوراک لباس مکان ہمارا النصب العین نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں تو لیہ جذبات یعنی پیدائش نفس میں کسی حد تک مفید پڑتی ہیں۔ اچھی خوراک اچھا لباس اور بہتر آسائش عمدہ جسم اور عمدہ دماغ و ادراک پیدا کرتے ہیں لیکن جس حد تک انسان آسائش کا غلام آجکل ہو چکا ہے اُسے تہذیب انسانی سے کوئی تعلق نہیں۔ جس قوم کی نگاہ ان باتوں تک ہو وہ آخر کار نسل انسانی کے دوسرے افراد کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے وہ اپنی بڑھائی ہوئی ضروریات کو بذات خود یا اپنے وطن میں تو پورا نہیں کر سکتے۔ اسلئے وہ ان گردنوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ جن پر وہ اپنا بوجھ ڈالیں ✦

نفس انسانی میں استعداد بلوغیت کا ہونا ہی ہمیں بتا کہتا ہے کہ انسان کی تہذیب سے معنے نفس انسانی کا

بالغ ہو جاتا ہے یعنی انسانی نفس میں جو جو استعدادیں ودیعت شدہ اور مخفی ہیں وہ ظاہر ہو جائیں - الہام دنیا میں اسلئے آیا - چنانچہ قرآن نے بھی اولٰئک علٰی ھدًی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون سے کہ غرض الہام یہ بتلائی - کہ وحی الٰہی ان راہوں کی تعلیم کرتی ہے جس پر چلکر انسان کے نفس میں چھپی ہوئی طاقتیں مثمر ہو جائیں - یہی فلاح کے لفظی معنے ہیں - اگر اس کے معنے کامیابی کے ہیں - تو اسی لئے کہ کسی کامیابی کی آخری حد اس وقت آجاتی ہے - کہ جب اسکی کل کی کل استعدادیں پورے طور پر کام دیجائیں - الغرض نفس انسانی اپنی پیدائش پر ایک مواد غیر مرتب شدہ کی شکل میں ہوتا ہے جس سے عمارت انسانیت طیار ہوتی ہے - یہ مختلف جذبات حیوانیہ جو حسب بیان بالا فطرت انسانی میں موجود ہیں وہ بمنزلہ خشت - پتھر - لکڑی - چونا وغیرہ مصالحہ کے ہیں - ان ہی کے موقعہ و محل پر استعمال ہونے سے انسان کے اندر عمارت اخلاق طیار ہوتی ہے یہ امر کیسے اور کس طرح ہو ہم جواب دینے سے پیشتر عالم نباتات یا عالم حیوانات پر غور کرتے ہیں - کہ وہاں جسم

کس طرح پرورش پاتا ہے۔ اور تعمیر بدن کس طرح ہوتی ہے

تربیت نفس مدرکہ کیلئے ایک قوت مدبرہ کی ضرورت

عالم تنظیم (آرگنائک ہا) یا یوں کہو۔ عالم نباتات وحیوانات کی اشیاء میں ایک قوت ہوتی ہے۔ جو ترکیب جسم کیلئے مفید چیزیں خارج سے لے لیتی ہے۔ اور غیر مفید چیزوں سے پرہیز کرتی ہے۔ اسے اصطلاح حکما میں قوت مدبرہ کہتے ہیں۔ اس کے ایک پہلو کا نام قوت ایصال خیر اور دوسرے کا نام قوت دفع شر ہے۔ اصل میں قوت دفع شر ہی مقدم اور ضروری قوت ہے۔ اگر وہ صحیح طور پر اپنا کام کرے۔ یعنی نظام جسم کو مضر چیز یا مضر مقدار سے بچالے تو باقی کائنات کی ہر ایک چیز اس جسم کے نشو ونما کیلئے مفید ہو جاتی ہے۔ گویا قوت دفع شر ایک داروغہ کا کام دیتی ہے۔ وہ عمارت جسم کے دروازہ پر کھڑے ہو کر غیر چیزوں کو اندر آنے سے روک دیتی ہے۔ باقی ہر چیز کیلئے اذن عام ہوتا ہے۔ اس طرح قوت دفع شر کے صحیح طور پر کام کرنے کے بعد قوت ایصال خیر اپنا کام شروع کرتی ہے یعنے کائنات میں تو ہر ایک چیز کے اردگرد اسکی خوراک ہر وقت

موجود ہے۔ لیکن انکی ایک مقدار اُس چیز کے جسم کی بناوٹ کے لئے مُفید اور دوسری مقدار غیر مفید ہوتی ہے ایساہی اس گردونواح میں بعض چیزیں اجسام کے لئے مُضر بھی ہوتی ہیں۔ اب اگر مُضر مقدار یا مُضر چیز سے وہ چیز بچ جاتے۔ تو باقی ہر ایک چیز اس کے نشوونما کیلئے مفید ہی مفید ہو جاتی ہے۔ اِن دو مُضرات سے بچنے کے لئے جسم حیوانی یا انسانی میں فطرت نے جو چیز رکھ دی ہے۔ اُسے ہی قوّت دفع شر کہتے ہیں۔ اسکے صحتِ عمل پر سب کچھ منحصر ہے۔ مثلاً سیب کا درخت اور تھوہر ایک ہی جگہ نشوونما پا سکتے ہیں۔ جس زمین میں وہ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہاں اُن کے اِردگرد انکی خوراک بھی مخلوط حالت میں موجود ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جن چیزوں سے اور جس مقدار اجزاء سے سیب تیار ہوتا ہے۔ وہ تھوہر کے لئے مُہلک ہے۔ اور جو تھوہر کی خوراک ہے وہ سیب کے لئے سم قاتل ہے لیکن پھر بھی ایک ہی زمین میں ایک ہی ماحول کے ہوتے ہوئے جہاں ان کی خوراک ہائے مختلفہ بھی الگ الگ نہیں بلکہ بالکل مخلوط شدہ ہیں۔ یہ دونوں درخت کامل نشوونما پا لیتے ہیں۔ یہ اسی قوّت مُدبرہ کے کرشمے ہیں۔ دونوں جگہ یہ قوت

مضر چیزوں کو چھوڑ کر مفید چیزیں اُٹھا لیتی ہے جس سے خشوہر اور سیب کی پرورش ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ہر ایک درخت میں اور ہر نباتاتی وجود میں یہ عمل طبعاً اور اضطراراً ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ گویا فطرت نے انہیں ایک ہدایت دے رکھی ہے۔ جس کے ماتحت قوتِ مُدبّرہ کام کرتی رہتی ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی باغ کی چاردیواری میں طرح طرح کی متضاد چیزیں ایک ہی ماحول سے اپنی اپنی غذا اور اپنی اپنی نشوونما حاصل کرتی ہیں۔ حیوانوں میں بھی یہی قوّت کام کرتی ہے۔ اسی کی ہدایت سے بکری۔ بھیڑ۔ گائے۔ بندر کبھی ایسی چیز پر مُنہ نہیں مارتے جو ان کے مضر ہو۔ ان کا مُنہ ہمیشہ اسی چیز پر پڑتا ہے۔ جو ان کے لئے مُفید ہوتی ہے +

ہمارے جسم کی پرورش میں بھی ان اُمور میں جہاں ہمارے فہم و ادراک یا تعقّل کا دخل نہیں ہوتا۔ یہی قوّتِ مُدبّرہ ہمارے علم و ارادے کے بغیر اضطراراً ہمارے اندر کام کرتی ہے۔ اگر احیاناً ہم مکھی نگل جائیں تو معدہ اسی قوت مُدبّرہ کے ماتحت اُسے فوراً باہر پھینکدیتا ہے۔ ایسا ہی اکل و شرب کے اس حصّہ کو جو پرورشِ جسم کے لئے ضروری

ہوتا نہیں لیکن جسم میں چلا جاتا ہے۔ یہی قوت پسینہ۔ بول براز یا دیگر قسم کے سیلان یا پھوڑا پھنسی کے ذریعہ خارج کردیتی ہے یہاں بھی جسم کے اندر قوت دفع شر کے صحیح کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اگر یہ قوت اپنا کام جاری رکھے۔ تو پھر جو بھی چیز جسم میں چلی جائے وہ جسم کا تندرست حصہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آنکھ اور کان میں اگر کوئی اجنبی اور غیر مفید چیز چلی جائے تو درد کا اُٹھنا گویا فطرت کی ایک شکایت ہوتی ہے۔ کہ اس چیز کو مجھ سے دُور کرو۔ الغرض قوت مدبرہ کے درست کام کرنے پر صحت جسم منحصر ہے۔ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں کہ جسم کے نمو کو نموِ انسانیت سے اسی قدر تعلق ہے کہ اس سے تولیدِ جذبات ہوتی ہے۔ اسی سے آگے تکمیل انسانیت میں جسم کو کوئی دخل نہیں۔ جس چیز کو انسانیت کے لئے تیار ہونا ہے۔ وہ اخلاق ہیں۔ جن کا مواد یہی جذبات حیوانیہ ہیں۔ یہی جذبات مناسب محل و موقعہ اور مناسب مقدار پر استعمال ہوکر اخلاق فاضلہ بنجاتے ہیں۔ جس سے حیوانی جذبات انسانیت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جسم کی طرح تعمیر اخلاق کے لئے بھی ہمیں اندر اک ایک قوّتِ مدبرہ کی ضرورت ہے۔ جو اضطرار اً بدی سے بچے

اور ایصال خیر کرے۔ اب ایک شخص غور کرلے۔ کہ جس طرح
کسی مضر چیز کے معدہ میں جانے سے معدہ کی قوت منقی
حرکت میں آجاتی ہے۔ اور معدہ اس کے خارج کرنے کیلئے
مبتلا تا ہے۔ آیا اس کے نفس میں کوئی ایسی چیز موجود
ہے۔ جو بدی کے موقعہ پر اس کے اندر گھن پیدا
کردے۔ اور اس کا نفس اس سے متلائے۔ پیدا ئشاً
یہ چیز ہم میں موجود نہیں۔ ہاں بعض حالات آئندہ ایسی
صلاحیت پیدا کردیتے ہیں۔ اخلاق کی عمارت جس پر
عمارت انسانیت کا حصر ہے ہم میں اُسی دن سے بننی
شروع ہوگی۔ جس وقت ہم میں ادراکاً قوت دفع شر پیدا
ہوکر ہمیں جذبات کے غیر محل استعمال سے روک لے۔
جس طرح مضر چیز کے کان میں جانے سے کان میں درد
شروع ہوجاتا ہے۔ جس طرح اسی قسم کی چیز کے آنکھ میں
جانے سے درد چشم شروع ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جب ہمارا
ادراک بد باتیں سننے اور بد منظر دیکھنے سے اضطرار آ
درد محسوس کرنے لگے۔ اس وقت ہمیں سمجھنا چاہئے۔ کہ
وہ قوت ہم میں پیدا ہوچکی۔ اس قوت کو قرآن نے نفس
لوامہ سے تعبیر کیا ہے۔ عام اصطلاح میں اسے کانشنس
کہتے ہیں +

ہم میں اِس قوت کی استعداد ہوتی ہے لیکن پیدائش
کے ساتھ ہی ہم میں یہ قوت ظاہر نہیں ہو جاتی یعنی
کانشنس جو برھمو سماج تھیالوجی کا مائیہ ناز ہے۔
پیدائشاً ہم میں موجود نہیں ہوتا۔ اور میں یہ ماننے
کو تیار ہوں۔ کہ اگر کانشنس ہمارے اندر شکمِ مادر سے
آئے تو بیشک ہمیں کسی اِلہام خارجی کی ضرورت نہیں۔
میں نے ابھی تھوہر اور سیب کی مثال دی ہے۔ یہ
دونوں درخت اپنی کیفیات میں بالکل ایکدوسرے سے
مختلف ہیں۔ پھر تم انہیں بیشک ایک ہی جگہ ایکدوسرے
کے نزدیک نزدیک اُگا دیکھو۔ ممکن نہیں کہ اُن کی یہ
مصاحبت ان کی مقرر کردہ اُٹھان بلوغت یا ثمریت
میں فرق ڈالے۔ لیکن تم دو انسانوں کو جو مختلف
اخلاق کے ہوں کچھ عرصہ کے لئے جمع کرکے دیکھ لو۔ وہ
ضرور ایکدوسرے کے اخلاق کو بگاڑ دیں گے۔ کیا وجہ ہے
کہ تھوہر کی روئیدگی سیب کو اور سیب کی مصاحبت
تھوہر کو اپنے رنگ میں رنگین نہیں کرتی۔ اور انسان پر
صحبت کا اثر ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جو قوت
دفعِ شر سیب یا تھوہر میں فطرت نے رکھ دی ہے۔ وہ
اِنسان کی فطرت میں استعداد ہو تو ہو لیکن سیب کی طرح

نشوونما یافتہ حالت میں نہیں ہوتی - اگر یہ ہوتی تو پھر کُل سے کُل انسان ایک ہی وضع پر واقع ہوتے یا ایک کی صحبت کا اثر دوسرے پر نہ ہوتا - ہاں تہذیب یافتہ اخلاق کے لوگ صحبتِ بد سے مُتاثر نہیں ہوتے - لیکن وہ تو بیرونی اور تعلیم مابعد کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی ایسی قوت کا نتیجہ جو کہ پہلے ہی سے انسان میں ہو - اسلئے جہانتک جسمانیات یا مادیات کا تعلق ہے - دو مختلف چیزوں کا ایک جگہ الگ الگ ہونا ایکدوسرے پر اثر نہیں ڈالتا لیکن دنیائے اخلاق میں وہی شخصیت صحبت بد سے بچ سکتی ہے جسمیں قوتِ دفع شر پیدا ہوچکی ہو - اخلاق کا تعلق اِدراک سے ہے نہ کہ جسم سے - اسلئے اخلاق جسمانیات سے نشوونما نہیں پا سکتے - اور جس طرح جسم کی بالیدگی جسمی اشیاء پر ہے - اِسی طرح ادراک کی بالیدگی پھل پھول سے نہیں ہوسکتی - اسکی تربیت و پرورش انہیں چیزوں سے ہوگی - جو ادراک کی شکل میں ہوں یعنے جن کا تعلق قوّت فہم - عقل - تصوّر - تخیّل سے ہو - مثلاً علمِ اصُول - قوانین - مشاہدات - تجارب - فے الجملہ جسم کی پرورش اگر پھل پھول سے ہوتی ہے تو ادراک یا نفس انسانی کی پرورش علم سے ہوتی ہے +

تعمیر اخلاق میں ہمارے اندر قوّتِ دفعِ شر کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ یہ امر ثابت ہو چکا ہے۔ کہ یہ قوّت ہمارے اندر نہیں۔ ہاں اس کے پیدا کر لینے کی استعداد ہم میں ضرور ہے۔ لہٰذا کوئی علم باہر سے آنا چاہئے۔ جس کی آبیاری سے یہ طاقت ہم میں پیدا ہو جائے۔ وہ علم خدا کا الہام لاتا ہے۔ الہام آکر ہمیں چند ہدایات دیتا ہے۔ جن کے ماتحت ہم میں بداخلاقیوں سے بچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس وقت یہ قوت کامل طاقت پالیگی۔ تو پھر قوّت ایصالِ خیر کامل طور پر کام کرکے ہر جذبۂ حیوانی کو ایک عُمدہ اخلاق بنا دیگی۔ اسلئے ہر انسان کا پہلا فرض یہ ہے۔ کہ وہ بدیوں سے بچنے والا بنے اور ایسی ہدایات کا جویاں ہو۔ جو اُسے ان چیزوں کی اطلاع دے۔ جن سے اُس نے بچنا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر مُضر امور سے بچنے کا علم و طاقت اسمیں پیدا ہو جاوے چنانچہ قرآن کریم نے اپنا پہلا کام یہی بتلایا۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ یہ کتاب بچنے والوں کے لئے ہدایت ہے۔ یعنی یہ کتاب اس امر کی ہدایت کریگی۔ کہ انسان نے کس کس چیز سے بچنا ہے۔ یہ قوت جب ایک دفعہ پیدا ہو گئی۔ اور انسان

مضر اخلاق و روح امور سے بلا تکلف اور طبعاً بچنے لگ گیا۔ تو پھر باقی دُنیا کی ہر ایک چیز اس کے لئے مفید ہی مفید رہجاویگی۔ انسان میں تقویٰ یعنے شر سے بچنے کی قوت پیدا ہونی چاہئے۔ پھر وہ صحیح راہ پر آسانی سے چل نکلیگا۔ اسلئے الہام الٰہی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہادیے تقوےٰ ہو۔ بعض نادان اس آیت پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ ایک متقی کو ہدایت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ اس فطرت کے راز پر غور کریں۔ ضرر سے بچنے یا امر خیر کو حاصل کرنے کی قوت تو فطرتاً ہر ایک چیز میں موجود ہوتی ہے۔ اور ایسا ہی انسان میں بھی ہے۔ لیکن جس طرح عالم جسمانیات میں ہر ایک چیز جانتی ہے۔ کہ کس چیز سے بچنے پر صحت جسم قائم رہ سکتی ہے۔ جیسے کہ ہم نے معدہ کی مثال دی ہے عالم ادراک میں وہ امر ہمیں حاصل ہیں۔ بلکہ بعض امور میں تو ہم جسمانیات میں بھی ادنےٰ حیوانوں سے گئے گذرے ہوئے ہیں۔ ایک بندر یا بکری تو مضر چیز کو اپنی خوراک نہیں بناتی لیکن زہریلی اشیاء میں تمیز کرنیکی طاقت ہم میں موجود نہیں ہوتی۔ یہ تمیز کچھ خارجی علم کے آنے پر ہی ہم میں پیدا ہو سکتی ہے۔ از خود ہم میں

یہ طاقت موجود نہیں ہوتی - یہ تو جسمانیات کا حال ہے
پھر ادراکیات تو اور بھی آگے ہیں - انسان خود
بخود نہیں جانتا - کہ کس چیز سے اُسے بچنا ہے -
اس امر میں وہ محتاج ہدایت ہے - پھر ایسے ہی
لوگ دنیا میں ہیں - جو ایسی ہدایت کی پرواہ تک
نہیں کرتے - وہ آہستہ آہستہ اس استعداد کو بھی
گنوا بیٹھتے ہیں - جس نے ہدایت پاکر قوت دفع شر
پیدا کرنی تھی - اب اگر یہ قوت انسان کے اندر
بالغ شدہ ہوتی - اور اپنے نشوونما کے لئے کسی بیرونی
اثر کی محتاج نہ ہوتی - تو وہ لوگ نسل انسانی میں سے
جو ہر ہدایت کی آواز پر بہرہ بن جاتے ہیں - اور
مشعل ہدایت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں - اور پھر
نتیجتًہ کسی خیر و خوبی کو حاصل نہیں کر سکتے - اِن لوگوں
کی تصویر ء انذرتھم ام لم تنذرھم (جن کو ڈرانا
نہ ڈرانا برابر ہے) نے ذیل کے الفاظ میں کھینچی ہے
ان میں استعداد قوت دفع شر آہستہ آہستہ مرجاتی ہے
جس سے نتیجتہً قوتِ ایصال خیر بھی تباہ ہو کر ان کی
آنکھ - کان - زبان پر مُہر لگجاتی ہے - صُمٌّ بُکْمٌ
عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿

معیارِ رُوحانیت

الغرض جب تک انسان میں قوت دفع شر پیدا ہو کر معاملات اخلاق و معاشرت میں مشین کی طرح ٹھیک اسی طرح کام نہ کرے۔ جس طرح کہ یہ قوت مضر جسم چیزوں کو جسم سے دُور کرنے میں کام کرتی ہے۔ اُس وقت تک ممکن ہی نہیں کہ تہذیب انسانی کی پہلی منزل سے بھی ایک قدم آگے انسان جا سکے۔ مثلاً اگر کسی کا معدہ ہی بگڑ جائے۔ یا اس کی انتڑیوں میں کوئی نقص پیدا ہو جائے۔ جس سے وہ مواد ردیہ کو طبعی طور پر خارج نہ کر سکیں۔ تو جسم کی صحت اور نمو میں فرق آجائیگا۔ اسی طرح عمارت اخلاق کی تعمیر میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہمارے اندر کج خلقیوں کے مقابل طبعی نفرت پیدا نہ ہو۔ جو لوگ اپنے آپ کو صاحب اخلاق یا رُوحانی انسان سمجھتے ہیں۔ وہ صرف اس ایک بات سے سمجھ سکتے ہیں۔ کہ وہ کہاں تک اپنے اسی خیال میں سچے ہیں۔ یا کہاں تک اپنے نفس کے دھوکے میں پھنسے ہیں۔ مثلاً ہر ایک انسان کو کسی نہ کسی

اشیاء خوردنی سے نفرت ہوتی ہے۔ جس کے دیکھنے میں
اس کا معدہ اُچھلنے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر غلط کاری
پر کسی کو اسی طرح گھن آئے تو وہ سمجھ لے کہ اس کے اندر
رُوح پیدا ہو چکی۔ کوئی بیرُونی چیز ہمارے کان یا
آنکھ میں چلی جائے تو اس سے درد پیدا ہوتا ہے
ایک کانٹا پاؤں میں چُبھ جائے تو درد ہمیں بےچین
کر دیتا ہے۔ اور جب تک وہ نکل نہ جائے یہ درد
جاری رہتا ہے۔ مواد ردّیہ اگر پسینہ وغیرہ کے ذریعہ
جسم سے خارج نہ ہو۔ تو پھوڑہ پھنسی بنکر عمل جراحی کی
ضرورت پیدا کر دیتا ہے یا مفسد معدہ ہو کر
جُلاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ اب جس طرح جسمِ انسانی
مُضر چیزوں کو اپنے سے دفع کرنے کے لئے یہ مختلف
شکلیں اختیار کرتا ہے۔ کہیں درد کہیں پیچش
کہیں متلی کو ان کے اخراج کے لئے پیدا کرتا
ہے۔ اگر اسی طرح کسی انسان کے دِل کے کان
اور آنکھ بد باتوں پر ویسی درد محسُوس نہ کریں تو وہ
سمجھ لے کہ وہ نفس کے دھوکہ میں آیا ہوا ہے
اگر وہ اپنے آپ کو نیک جانتا ہے۔ بعض انسانوں میں

تو بدی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اور اپنی خواہشات رذیلہ کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتے۔ نفس کی اس حالت کو قرآن نے نفس امّارہ کا نام دیا ہے۔ مگر بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں احساس بدی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مواقعات پر ٹھیر جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک قسم کا خلجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تامّل کرتے ہیں۔ کہ ارتکاب بدی وہ کریں یا نہ کریں۔ بعض وقت وہ مغلوب ہو کر مرتکب بدی ہو جاتے ہیں۔ بعض وقت تحریص بدی پر غالب آ کر اس کے ارتکاب سے بچ جاتے ہیں۔ نفس کی یہ خلجانی حالت پہلی حالت سے تو بہتر ہے اور مبارک بھی ہے۔ کیونکہ اس کے قیام پر ہی نفس امّارہ کی موت ہے۔ نفس کی اس کیفیّت کا نام قرآن نے نفس لوامہ رکھا ہے لیکن یہ منزل مقصود نہیں نہ اس مقام پر نفس انسانی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کی ترقی کر سکے۔ انسان اگر نفس لوامہ کی آواز سنتا رہے۔ اور اسکی منشاء کو نفس امّارہ کی خواہش پر ترجیح دیتا رہے۔ تو ایکدن اُس مقام پر پہنچ جائیگا۔ جب بدیوں سے بچنے میں اور حسنات

سے اختیار کرنے میں اُسے تکلّف نہ کرنا پڑے۔ مشین کی طرح وہ بدیوں سے بچے اور نیکیوں کو اختیار کرے۔ اس معاملہ میں اُسکی طبیعت تکلّف سے نکلکر اضطرار کا رنگ اختیار کرے۔ نیکی کو اسلئے نہ کرے کہ اس سے کسی وجود مثلاً خدا کی خوشی متصوّر ہو۔ یا پبلک رائے اس سے یہ توقع کرتی ہے۔ بلکہ جس طرح معدہ نے روٹی کی بھوکھ لگا رکھی ہے۔ ویسے ہی اسکی فطرت میں حسنات کی اشتہا ہو۔ جس طرح ہماری قوت شامہ متعفن مقامات سے اطلاع دیکر ہمیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسیطرح جبتک ہم میں بدیوں سے وہی وحشت نہ ہو جائے۔ تب تک یہ نہیں کہ سکتے۔ کہ نفس انسانی اس مقام پر پہنچگیا ہے۔ کہ جہاں ترقی نفس کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اس مقام پر نفس انسانی کا نام نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ نفس کی اس تکمیل کا دن ہی پیدائش رُوح کا دن ہے۔ اس کیفیت نفس کے بغیر جو اپنے آپ کو روحانی انسان سمجھتا ہے تو وہ نفس کے دھوکہ میں ہے۔ جس چیز کا نام برہمو ساجیوں نے کانشنس رکھا ہے۔ اور جس کی آواز کو وہ آواز الہام

کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت نفس لوامہ سے زیادہ نہیں۔ اور نفسِ مطمئنہ تو اس سے بھی آگے ہے حالانکہ خود نفسِ مطمئنہ سالک کی پہلی منزل ہے۔ اس سے سمجھ آسکتی ہے۔ کہ انسان کہاں تک اس ہدایت کا محتاج ہے۔ جس کا نام الہام الٰہی ہے +

برہمو سماج غور کرے

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کیفیات کی استعداد نفسِ انسانی میں موجود ہے۔ لیکن امرِ غور طلب یہ ہے کہ آیا یہ استعداد بالغ ہونے کے لئے کسی خارجی ہدایت کی محتاج ہے۔ یا اندر ہی اندر یہ بالغ ہو کر حسب عقیدۂ برہمو سماج کانشنس بن جاتی ہے مختلف انسانوں میں اس کانشنس کا مختلف مدارج پر ہونا کہتا ہے۔ کہ یہ قوت اندر ہی اندر خود بخود تو بالغ نہیں ہو جاتی۔ جس طرح ہر ایک بچہ بلا علم و ارادہ آہستہ آہستہ سنِّ بلوغت کی طرف آجاتا ہے۔ اور بہت تھوڑے ہیں۔ جو حسب استعداد جسم قوت بدن حاصل نہ کریں۔ اگر یہ قوت بھی جسم کی طرح بلا تحریک خارجی بڑھنے والی ہوتی تو ہر ایک انسان

میں یہ قوت قریب یکساں طور پر کام کرتی - یہ تفاوت امیں اُن خارجی حالات کا پتہ دیتا ہے جو مختلف انسانوں میں مختلف طریق پر لاحق ہوکر مختلف کانشنس پیدا کرتے ہیں +

جسم کے متعلق بھی جو قوت دفع شر اضطراراً کام کرتی ہے - وہ بھی تو خوراک جسم سے ہی پرورش پاتی ہے - اسکی بلوغت کا راز بھی تو وہ چیزیں ہیں جو باہر سے اندر جاتی ہیں - اسی طرح کانشنس کی استعداد بھی کسی بیرونی خوراک سے ہی بالغ ہوسکتی ہے - اسکی خوراک کی نوعیت بھی وہی ہوگی - جو خود اسکی نوعیت ہے - اگر عالم جسمانیات میں قوت دفع شر اور قوت ایصال خیر عمدہ جسمانی خوراکوں سے مضبوط ہوتی ہیں - تو پھر کانشنس کو چونکہ ادراک سے تعلق ہے - اسلئے اسکی خوراک بھی وہ علم ہوگا - جو باہر سے آویگا +

کانشنس از خود پیدا نہیں ہوتا

قرآن نے سورۂ نحل میں مضمون الہام پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر ایک اعتراض کا جواب دیا ہے - چنانچہ

ذیل کی آیت برہموسماج کے عقاید کو حسب ذیل طریق پر زیر بحث لاتی ہے ÷

واللہ اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون

بطن مادر سے تمہیں اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ اس وقت تمہیں کوئی بھی علم نہیں ہوتا۔ خدائے تعالیٰ نے تمہیں آنکھ۔ کان اور دل دیا ہے۔ کہ تم شکر گذار بنو۔ اس آیت میں یہ تعلیم دیگئی ہے۔ کہ کسی قسم کا علم بھی تمہارے اندر نہیں ہوتا۔ تمہارے علم کے بڑے ذرائع آنکھ اور کان ہیں۔ ان ہی راستوں سے بیرونی باتوں کا علم تمہیں ہوتا ہے۔ ہر نئے علم پر تمہارا دل محاکمہ کرتا ہے۔ اگر وہ بات پسند خاطر ہوئی تو مستقل رنگ میں وہ تمہارے علم کا حصّہ ہوجاتی ہے یہ اصُول قرآن کہ علم باہر سے آتا ہے اور اندر سے نہیں نکلتا۔ جیسے قرآن کی اس مدلل آیت نے مبرہن کردیا۔ ہمارے ہر ایک قسم کے تحصیل کردہ علم پر حاوی ہے۔ اگر علم اندر سے ہوتا۔ تو پھر یہ آنکھ کان بیکار تھے۔ کسی علم کا نام لیلو۔ وہ باہر ہی سے آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حصُول علم کی استعداد انسان کے

اندر ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے
کہ کانشنس کی بھی استعداد ہمارے اندر ہے۔ جو
آہستہ آہستہ تکمیل پائیگی۔ لیکن آیت بالا کی تائید
میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ انسان کی کوئی استعداد
ایسی نہیں کہ جس کا نشوونما اندر ہی اندر ہو جائے
بلوغت استعداد ہر امر میں خارجی تحریکات سے
تعلق رکھتی ہے۔ زبان میں استعداد ذائقہ تو ہے
لیکن مختلف ذائقوں میں تمیز کر سکنے کے قابل اسیوقت
زبان ہوتی ہے جب ہمیں مختلف کھانوں یا چیزوں
کے چکھنے کا موقعہ ملے۔ ہمارے گلے میں طرح طرح
کی آوازیں نکالنے کی استعداد ہے۔ اور ہمارے
کان میں موسیقی کے ہر زیر و بم میں تمیز کرنے کی
استعداد ہے لیکن یہ دونوں استعدادیں اسیوقت
پنپتی ہیں۔ جب خارج میں قسم قسم کی آوازیں
اور طرح طرح کے راگ راگنیاں پیدا ہو کر ہمارے
کانوں کے ذریعہ دل تک پہنچ جائیں۔ آنکھوں
میں یہ استعداد ہے۔ کہ وہ ہزار در ہزار رنگوں میں
تمیز کرے۔ اچھے برے منظر کی شناخت کرے۔
لیکن حسب فرمودہ قرآن یہ تمیز و شناخت ہم بطن مادر

سے تو نہیں لائے خارج میں ہی چیزیں ہمارا منظر بنکر ہماری استعداد تمیز کو بڑھا دیتی ہیں۔ کان آنکھ چونکہ ذریعہ علم کے دو خاص اعضاء ہیں اس لئے قرآن نے ان ہی کے ذکر پر اکتفا کیا والّا لمس۔ ذائقہ۔ شامہ سب کا یہی حال ہے۔ مختلف خوشبوؤں میں تمیز وہ ہی کرتا ہے جسے خارج میں مختلف خوشبوئیں سونگھنے کا موقعہ ملا ہو یہ سارے نظائر اسی ایک بات کو ثابت کرتے ہیں کہ علم باہر سے آتا ہے۔ ہم میں ہر ایک چیز کی استعداد ہوتی ہے۔ اس کا تعلق جسم سے ہو یا اِدراک سے۔ اخلاق سے ہو یا رُوح سے۔ اس استعداد کا بڑھنا موادِ خارجیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی باہر سے ہی کوئی چیز آکر اُسے اُبھارتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر خود بخود نشو و نما نہیں پاتی۔ لہٰذا برہمو سماج کا یہ عقیدہ معقولیت سے خالی ہے۔ کہ ہماری ہدایت کیلئے اور ہمیں نیک و بد میں تمیز کرانے کے لئے فطرت نے ہمارے اندر کانشنس پیدا کر رکھی ہے اسلئے ہم کسی الہام خارجی کے محتاج نہیں ہم اسبات کے تو قائل ہیں۔ کہ نفس انسانی میں اسکی تمیز تو موجود ہے۔

لیکن وہ چیز بالفعل نہیں ہو سکتی جب تک باہر سے ہدایت نہ آئے۔ مختلف قسم کی صحبتیں انسان میں طرح طرح سے معیار اخلاق پیدا کر دیتی ہیں۔ بعض اقوام جرائم پیشہ کے نزدیک چوری ڈکیتی مایۂ عزت ہے۔ ہمارے بعض رئیس الناس علیٰ دین ملوکھم کے ماتحت شراب پینا ہی وجہ شرافت سمجھتے ہیں تو پھر اُن کے کانشنس کو کیا ہؤا ہے۔ اگر یہ ایک اندرونی جوہر تھا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ مر گیا۔ یہ امر صحیح ہے لیکن اسکی موت کی وجہ صحیح خوراک کا نہ ملنا۔ اور بُری خوراک کا میسر آنا تھا۔ اور یہ دونوں بیرونی چیزیں ہیں اور اگر صحبتِ صالح اور صحبت طالح سے صالح اور طالح انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو پھر کانشنس کوئی از خود پیدا شدہ اندرونی چیز نہیں جو ہمارے لئے موجب راحت ہو۔ نفس انسانی میں ایک استعداد حصُول علم ہے۔ باہر سے آیا ہؤا علم آہستہ آہستہ جزو مُدرکہ انسانی ہو کر ہمارے لئے اچھا یا بُرا رہنما ہو جاتا ہے اگر صحیح اور مفید علم مذکُورہ بالا استعداد نفس کی پرورش کا موجب ہو گیا۔ تو نفس انسانی کانشنس بن جاتا ہے۔ ورنہ اس کا نام و نشان بھی کہیں فطرت میں نظر نہیں آتا

الغرض ہمیں اُس صحیح اور مفید علم کی ضرورت ہے جو آہستہ آہستہ ہماری قوت محاکمہ کو مضبوط کرکے ہم میں ایک طاقت سلیم پیدا کردے۔ جس سے ہم وجداناً یعنی طبعی اور اضطراری طریق پر یا موٹے الفاظ میں آنکھیں بند کرکے غلط راہوں سے بچیں۔ اور صحیح راہوں پر قدم زن ہوں۔ حصول علم کی دو راہیں ہیں۔ ایک انسانی دوسری رحمانی۔ انسانی طریق تجربہ اور مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی صحت بعض مصائب شدیدہ سے ہوتی ہے۔ بلکہ جو بات مصائب میں پڑ کر حاصل ہوتی ہے۔ وہی علم راسخ کا حق رکھتی ہے قرآن نے ان راہوں کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ بلکہ انسان کو ان کی تحریص بھی دلائی ہے۔ اور مصائب کی حقیقت بھی ہم پر یہی ظاہر کی ہے۔ جیسے کہ آیت ذیل اشارہ کرتی ہے:-

ولنبلونکم بشیٍٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ط وبشر الصّٰبرین

ترجمہ۔ اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جان اور پیداوار (ارضی) کی کمی سے آزمائینگے۔ اور (اے پیغمبر) صبر کرنیوالوں کو

خوشخبری سُنادو۔

لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ یقینی اور قطعی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جیسے کہ ہمنے اُوپر کہا ہے۔ اس علم کی صحت کے لئے انسان کو بعض وقت طرح طرح کے مصائب اُٹھانے پڑتے ہیں۔ وہ غلط بات کو صحیح سمجھ کر قدم زن ہو جاتا ہے۔ لیکن انجام کار نقصانات سے ہی اسکی صحت قدم ہوتی ہے بعض قوانین کی ترمیم کی ضرورت ان نقصانات پر بھی ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہ دیکھتے ہیں۔ کہ اس نے ہماری ہر ایک جسمی قوت و استعداد کی آبیاری کے سامان ازخود پیدا کئے ہیں تو کیوں اس استعداد کے سامان آبیاری کیلئے وہ بیفکر ہو۔ کہ جس نے ہم میں نیک و بد کی تمیز پیدا کر کے ہمیں صحیح رستہ پر چلانا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اس استعداد کے مقابل باقی کُل کی کُل استعداد ہائے جسم ہیچ ہیں۔ لہٰذا جب جسم کی پرورش کے اسقدر سامان دستِ قدرت نے پیدا کر رکھے ہیں۔ تو ہمارے نفس اور ادراک کی تربیت کے لئے وہ کیوں الیباشہ کرے۔ پرورش جسم میں

جو قوت مدبرہ یعنے قوت دفع شر و قوت ایصال خیر کام کرتی ہے۔ وہ بھی تو پیدائش جسم کے وقت بہ رنگ استعداد ہی ہم میں موجود ہوتی ہے۔ اسکی تربیت کے لئے بھی تو خارج سے ہی خدا کی پیدا کردہ خوراک آتی ہے۔ اس میں بھی تو انسان کا حصہ بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے۔ بلکہ جو ان خوراکوں کو پیدا کرتا ہے۔ اور ان میں جوہر حیات ڈالتا ہے وہ تو **آسمان** سے اُترا ہوا **پانی** ہوتا ہے پھر کیوں اس زبردست استعداد تمیز نیک و بد کی آبیاری اور تربیت کا سامان خدا تعالےٰ کے اپنے ہاتھ سے نہ ہو۔ اور اسکی پرورش کیلئے جو خوراک ضروری مُہیّا ہو۔ اس کے لئے بھی پانی آسمان سے نازل ہو۔ کیونکہ اس استعداد نے ہی انسان کو انسان بنایا ہے۔ نفس مدرکہ تو حیوانوں میں بھی تھا لیکن اُن میں یہ زبردست استعداد نہ تھی۔ ہاں یہ دونوں پانی نوعیت میں ایکدوسرے سے الگ ہونگے پہلا پانی جو بادلوں سے اُترتا ہے۔ چونکہ اُسے جسم کی پرورش سے تعلق ہے۔ اور وہ زمین سے روئیدگیاں پیدا کر کے جسم انسان کی خوراک بناتا ہے

اس لئے وہ جسمانی شکل میں ہوگا یعنے
از قسم مادہ ہوگا۔ لیکن دوسرے پانی نے نفس
مُدرکہ کی استعدادوں کو اُبھارنے کے لئے خور اک
ادراک پیدا کرنی ہے۔ اسلئے وہ پانی جسمانی لباس
میں نہیں آسکتا۔ اس کا لباس بھی لباس ادراک
ہونا چاہئے۔ جس زمین پر اس نے برسنا ہے وہ
بھی جسمانیات سے نہیں ہوسکتی۔ اس کا تعلق بھی
ادراکیات سے ہونا چاہئے۔ ہاں وہ شکل میں
زمین سے ملتی جلتی چیز ہے یعنے قلب انسانی۔
اسلئے یہ اس زمین کی آبیاری کیلئے جو پانی آسمان
سے اُترتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے علم ہے۔ جو
الہام کی شکل میں کسی قلب سلیم پر نازل ہوکر اسمیں
سے علمی روئیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ اس علمی
خوراک سے دوسرے انسان اپنے نفوس میں ادراکی
قوّت مُدبّرہ یعنے قوّتِ دفع شر اور قوّت ایصال خیر
پیدا کرکے حقیقی منزل مقصود کے شاہراہ پر چڑھ جاتے
ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۂ نحل میں
ایک اور مقام پر یُوں بیان کیا ہے:

وعلى الله قصد السبيل ومنها جائر ولو شاء لهداكم

اجمعین ہ الذی انزل من السماء ماءً لکم منه شراب و
منه شجر فیه تسیمون ہ ینبت لکم به الزرع
والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات
ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون (سورۃ نحل رکوع ۲)
اور یہ تو خدا تعالیٰ پر (انسان کا حق) ہے کہ خدا تعالیٰ
اُسے صحیح راہ دکھلائے۔ (کیونکہ) غلط راہیں بھی ہیں
اور اگر خدا کی مشیت ہو تو وہ سب کو ہدایت پر ہی
چلائیگا۔ وہی آسمانوں سے پانی اُتار کر پینے کی چیزیں
اور درخت پیدا کرتا ہے۔ اس پانی کے ذریعہ وہ
طرح طرح کی روئیدگیاں نکالتا ہے۔ زیتون کھجوریں
انگور اور پھر ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے۔ غور و
فکر کرنیوالوں کے لئے اسمیں نشانیاں ہیں۔ یہ الفاظ
ربانی کسی تشریح کے محتاج نہیں ان میں بھی فرمایا گیا
ہے۔ کہ تمہارے تربیت جسم کے لئے جب آسمان
سے پانی اُتر کر تمہارے لئے طرح طرح کی خوراکیں پیدا
کرتا ہے۔ اور انہیں خوراکوں کو کھا کر تم میں نفس
مُدرکہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کے آگے غلط اور اصل
راہ سے الگ بہت سے راہ ہیں تو پھر یہ بات بھی
اُسی خدا تعالیٰ کے ذمے ہے۔ کہ وہ تمہیں صحیح رستہ

بھی دکھلاوے +

وہ قوت مُدبّرہ جس کے صحیح عمل پر صحت جسم کا حصر ہے ۔ اسکی پرورش اور اس کا نشوونما اگر خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے پیدا کردہ خوراک کے ذریعہ ہی ہوتا ہے تو پھر رُوح اور اخلاق کی تعمیر کے لئے جس قوتِ مُدبّرہ کی ضرورت ہے ۔ اسکی پرورش کا سامان ہم ازخود کیسے کرسکتے ہیں ۔ اگر ہمارا یہ استدلال غلط ہے ۔ تو تم جسمانیات میں اس قوت کے پیدا کرنے کا کوئی طریق نکالو ۔ لیکن اگر ربانی طریق کے علاوہ کوئی اور طریق نہیں ۔ تو پھر ہم معاملات رُوح و اخلاق میں کسی اور راہ کی طرف کیوں دیکھیں ۔ علاوہ ازیں جسمی پرورش کے لئے جو سامان دست قدرت مُہیّا کرتی ہے ۔ اسمیں کس قدر تھوڑا حصہ اِنسان کا ہوتا ہے ۔ زمین خدا کی پیدا کردہ ہے ۔ اُسمیں طرح طرح کے خزائن رحمٰن نے پہلے سے ہی رکھ چھوڑے ہیں ۔ ان خزائن کو متحرک کرنے کے لئے اور اُن کو خوراک انسانی بنانے کے لئے پانی بھی وہی رحمان خدا بھیجتا ہے ۔ سُورج ۔ چاند ۔ ستارے ۔ مختلف قسم کی گیسیں ۔ سب کے سب ملکر کام کرتی ہیں ۔ اِنسان کی صرف اسی قدر کوشش ہوتی ہیں ۔ کروہ

زمین کھود کر تخم ڈالدیتا ہے۔ باقی تو سب کچھ خدا کا ہی فعل ہے۔ یہی حالت اس خوراک کی ہونی چاہئے جس پر رُوح نے پرورش پانی ہے۔ اگر کسی اور طریق پر وہ خوراک طیار ہو تو کسی صورت میں وہ موجب صحت نہیں ہو سکتی۔

الہامِ الٰہی کہاں ہونا چاہئے

اموُرات بالا پر غور کرنے سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان کا خدا پر حق ہے تو خدا تعالےٰ اُسے فجوُر و تقویٰ یعنے معاملات خیر و شر کے متعلق الہام کرے۔ نیز یہ حق بلا تمیز قوم و ملک اور ایسا ہی بلالحاظ مکان و زمان ہر ود و بشر کو پہنچتا ہے جس وقت اور جہاں کہیں ابن آدم ہو وہ خداوند سے الہام ہدایت کا مستحق ہے۔ بات تو سیدھی تھی۔ لیکن اسلام سے پہلے کسی مذہب والے نے کسی دوسری قوم کو اس عزت کا مستحق نہ سمجھا۔ ہر ایک نے اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے اور باقی دوسروں کی تعلیمات کو انسانی مفتریات سمجھا۔ اس سے نسل انسانی کے مختلف طبقات

میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلی۔ اور اُدھر
وید کے ماننے والوں نے دوسروں کو ملیچھ سمجھ کر
انہیں اپنی کتاب مُقدس کی شکل تک دکھلانی حرام
سمجھی تو دوسری طرف مسیح جیسے منکسر المزاج انسان
نے بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنی نہ چاہی
یہ الفاظ اس کے ملائم ہونٹوں سے اسوقت نکلے
جب ایک غیر اسرائیلی ضعیفہ آپ سے ہدایت کی
طالب ہوئی۔ آج بھی آریہ عیسائی اور یہودی
اپنے اپنے مذہب کے سوا باقی مذاہب کو منجانب اللہ
نہیں جانتے۔ اگر مذہب کی ایک بھاری غرض خدا
کی عزت و جلال کو قائم کرنا ہے۔ تو یہ کم ظرف عقیدہ
ایک وسیع القلب انسان کے خیال میں خدا کی
چنداں عزت قائم نہیں کرتا۔ خدا نے عالمین کیا۔
اور ہدایت کے لئے کسی قوم کو انتخاب کر لیتا گیا۔ یہ
لوگ غور نہیں کرتے کہ جس خدا تعالےٰ نے جسمانی پرورش کیلئے
نسل انسانی کے کسی طبقہ کو بھی اپنی ربوبیت کے فیض
سے محروم نہ رکھا۔ وہ رُوحانی پرورش میں کیوں کسی کا
طرفدار ہو کر دوسروں کو محروم رکھنے لگا۔ خدا کی جناب
میں اسکی سب مخلوق یکساں ہے۔ جس خدا نے کل انسانوں

کو ایک ہی قسم کے اعضاء بخشے۔ ایک ہی طرح کا دل و دماغ دیا۔ پھر پرورش جسم کے لئے ہر جگہ پر زمین آسمان۔ سورج۔ چاند۔ ستارے ہوائیں الغرض کُل کے کُل مظاہر قدرت یکساں طور پر بخشے۔ وہ تربیتِ رُوح میں کس طرح کسی کو بھول سکتا تھا۔ یہ کوئی ایسی باریک منطق نہیں کہ جس کا سمجھنا کسی اہل مذہب پر مشکل ہو۔ لیکن کسی نے بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ حتیٰ کہ قرآن کریم آیا۔ اس نے پہلے فقرہ میں ہی اِن تلخ خیالیوں کا قلع قمع کر کے خدا تعالےٰ کے نام سے الحمدللہ رب العالمین کہہ کر دھبہ دھویا۔ انجیل اور توریت کی طرح کتاب حمید نے خدا کو ربِّ موسیٰ۔ ربِّ ہارُون۔ یا ربِّ اسرائیل نہیں پکارا۔ بلکہ ربّ العالمین کہا۔ یعنی وہ ہند و مسلم۔ عیسائی۔ مُوسائی۔ چینی۔ تاتاری حبشی۔ انگریز سب کا جسماً یا رُوحاً یکساں طور پر پرورش کنندہ ہے۔ جس طرح اس نے سب کو جسمانی رزق عطا کیا۔ اسی طرح اس نے سب کو رُوحانی روٹی بھی بخشی۔ اس نے ہر طبقۂ انسانی میں نبی بھیجے۔ ہر قوم کو پیغمبر عطا کیا۔ ہر ملک میں نذیر بھیجے۔ چنانچہ

قرآن نے اس پر شہادت دی ہے۔ لکل قوم ھاد و ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔ و لکل امۃ الرسول (ہر ایک قوم کو ہادی دیا گیا ہر ایک اُمت کیطرف ڈرانیوالا آیا۔ ہر اُمت کیلئے رسُول ہوا +

ان آیات کے ہوتے ہُوئے ایک مُسلمان کی مجال نہیں۔ کہ وہ کسی قوم کو فیض نبوّت سے محرُوم سمجھے۔ ہم مسلمان ان قرآنی تعلیمات کے ماتحت ایمان رکھتے ہیں۔ کہ ہندوؤں میں بھی سری مہاراج کرشن اور رام چندرا جیسے ہادی آئے۔ چین کی ہدایت کے لئے اگر جناب کالفیوشسش اُٹھے۔ تو ایران کی سرد رُوحانیت کو گرمانے کے لئے جناب زرتشت عشقِ الٰہی کی آگ سُلگانے آئے۔ الغرض کوئی قوم نہ رہی جس کی ہدایت کو کوئی نبی نہ آیا۔ اور کوئی ملک نہ تھا جہاں کوئی صحیفہ نازل نہ ہوا +

کیا قسمت کا اُلٹ پھیر ہے کہ جو کتاب اس قدر زبردست وسعت قلبی کی تعلیم دنیا کو دے۔ اُسی کے ماننے والوں پر آج تنگدلی کا الزام دیا جائے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ مسلمانوں میں مذہبی رواداری نہیں۔ وہ اپنے

مذہب کے سوا کسی اَور مذہب میں کوئی خیر و خوبی نہیں مانتے۔ کیا یہ الزام اس کتاب پر دیا جاسکتا ہے جس کی تعلیم اسقدر وسیع ہو۔ قرآن تو کہتا ہے کہ خداتعالےٰ نے ہر قوم اور ہر اُمّت کو نبی اور رسُول دیا ہے۔ کوئی اس تعلیم کا عشرِ عشیر کسی اور قوم میں دکھلا دے۔ تو پھر یہ اعتراضات حق بجانب ہونگے ہمنے توریت۔ انجیل و بید مقدّس اور ژندواوستا کے بھی بعض حصص بغور پڑھے۔ کانفیوشس کے وصایا کا محبت سے مطالعہ کیا۔ ہمیں تو ایک فقرہ بھی ان کُتب مقدّسہ میں نظر نہیں آتا۔ جو دوسرے مذاہب کے بانیوں کو منجانب اللہ ماننے کی تعلیم دے۔ قرآن نے اگر آیات بالا میں اِس اصُول حقّہ کا ذکر مجملاً کر دیا تو دوسری جگہ بالتشریح اسی امر کو بیان کر کے نہ صرف غیر اقوام کے انبیا کو بحیثیت نبی تسلیم کرنے کا حکم دیا بلکہ یہ بھی تعلیم دی کہ انہیں اپنا نبی مانو۔ اور اپنے نبیوں میں اور انمیں فرق تک نہ کرو۔ قولوا امنا باﷲ وما انزل الیک وما انزل علیٰ ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ولیعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتے النبیون من ربھم ۔ لا نفرق بین احد منھم

ونحن لہ مسلمون مسلمانو تم ان کو کہدو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ اور اس پر جو ہم پر (بذریعہ آنحضرت صلعم) نازل ہوئی۔ ایسا ہی جو جناب ابراہیمؑ۔ اسمعیلؑ۔ اسحٰقؑ یعقوبؑ اور دیگر قبائل پر نازل ہوا۔ اُسے بھی مانتے ہیں ہم اُن تعلیمات کو بھی قبول کرتے ہیں جو جناب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور خدا کے تمام نبیوں کو دیگئی ہم نبی اور نبی میں کوئی فرق اور تمیز نہیں کرتے (اور کیوں کریں) ہم تو خدا کے ماننے والے ہیں ہم مسلمان موحد ہیں۔ کوئی نبی یا رسول پرست نہیں جو ہمیں اس نبی اور اُس نبی سے تعلق ہو۔ ہم نے تو خدا اور اس کے کلام کے آگے سر جھکانا ہے۔ جس نبی کی معرفت ملے وہ ہمارا سر تاج ہے۔ ہم اگر کسی مقدس انسان کی عزت کرتے ہیں تو اسلئے کہ وہ ہمارے خدا کا پیغام رساں ہے۔ ہمارے خدا نے انسانوں میں سے اُسے رسالت کے لئے چن لیا ہے۔ اور اس طرح اسے مصطفٰے و مجتبیٰ کیا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے۔ تو ہم مسلمان ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر میں فرق ہی کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام بحیثیت منصب رسالت تو ایک ہی شان اور حیثیت کے انسان ہیں لیکن اِس

منصب کی خدمت ہیں اور خلق اللہ تک ہدایت پہنچانے کے لئے دل میں خاص تڑپ رکھنے کے باعث ایک نبی دوسرے نبی پر فضیلت لیگیا ہے۔ اور یہ وہ امر ہے۔ کہ جس کے رُو سے کسی نبی کو محمد رسُول اللہ علیہ السلام سے کوئی نسبت نہیں +

ضرورتِ قرآن

یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قرآن کے حکم کے ماتحت ہمیں نہ صرف مذاہب کے کتب مقدسہ کو منجانب اللہ ہی قبول کرنا ہے۔ بلکہ اگر وہ ہمیں اپنی شکل و صورت میں ملجائیں تو ان پر ایمان بھی لانا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب نزول قرآن سے پہلے ہر ایک قوم کے ہاتھ میں ایک خدا کی کتاب تھی بلکہ کہا جاتا ہے۔ کہ صالح نبی عرب میں مبعوث ہوئے تو پھر قرآن کے نزول کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر بالفرض صالح علیہ السلام عرب کے لئے نبی نہ تھے۔ اور عرب بھی ایک نبوت کا مستحق تھا۔ تو پھر قرآن کو چاہئے تھا کہ اپنے دائرہ تبلیغ کو عرب تک ہی محدود رکھتا۔ اُسنے

کا فتنا للناس کو صلائے عام کیوں دی - اور صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کل رُوئے زمین کیطرف مبعوث شدہ نبی کیوں قرار دیا - جیسے کہ قرآن نے کہا کہ لتکون للعالمین نذیرا - بہتر ہے کہ اس سوال کا جواب قرآن سے ہی پوچھا جائے +

قرآن میں یہ ایک عجیب بات ہے - کہ اس پر اور کتابوں کی طرح مدعی سست گواہ چست کا فقرہ صادق نہیں آتا - معاملاتِ مذہب میں قرآن یا اسکی تعلیم پر کوئی اعتراض کیا جائے - اس کا جواب قرآن خود دیا کرتا ہے - اور بات بھی صحیح ہے - کہ اگر خدا عالم الغیب کی طرف سے ایک کتاب آئے - اور اسمیں کسی آیندہ ہونے والے اعتراض کا جواب نہ ہو تو پھر وہ کامل کتاب نہیں ہوسکتی - اور نہ وہ کتاب آخر ہوسکتی ہے - یہ بھی تماشہ ہے - کہ خدا صاحب تو خود خاموش رہیں اور کوئی اور انکی طرف سے وکالت کا حق ادا کرے - بہرحال اور مقدس کتابیں اس قسم کی وکالت سے اپنے اپنے مذہبی متکلمین کی محتاج ہوں تو ہوں لیکن قرآن جیسی مہیمن کتاب خواجہ کمال الدین کی وکالت کی ہرگز ہرگز محتاج نہیں بنے

انہیں اوراق میں کہیں لکھوایا ہے - کہ معاملۂ الہام
میں جسقدر یا جس قسم کا کوئی سوال یا اعتراض اُٹھایا
جاسکتا ہے - ان سب کا جواب قرآن نے خصوصاً
سُورۂ نحل میں دیدیا ہے - چنانچہ اس اعتراض کا
جواب بھی اسی جگہ موجود ہے - قرآن کہتا ہے
تاللہ لقد ارسلنا الی امم من قبلك
فزین لھم الشیطن اعمالھم فھو ولیھم
الیوم ولھم عذاب الیم ٥ وما انزلنا علیك
الکتب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ
وھدی ورحمۃ لقوم یومنون ٥ واللہ انزل
من السماء ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا
ان فی ذلك لایۃ لقوم یسمعون ٥ ترجمہ - ہمیں
اپنی ذوات کی قسم ہمنے بیشک تم سے پہلے تمام قوموں کو
رسول بھیجے لیکن آج (ان قوموں نے ان رسولوں کی
تعلیم کو تو پس پشت ڈال دیا) شیطان ان کا ولی
ہو رہا ہے - جس نے ان کے (بد) اعمال کو اُن کی
نگاہ میں خوبصورت کر دکھایا ہے - ان کے لئے عذاب
الیم ہے (وہ تعلیم مذہب میں ایکدوسرے سے اختلاف
کرتے ہیں - گو سارے مذہب تو ہمارے ہی طرف سے ہیں

لیکن نہ صرف مختلف مذاہب والوں کو ایکدوسرے سے
اختلاف ہے۔ بلکہ ایک ہی مذہب کے پیرو ایکدوسرے
سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لہذا یہ کتاب یعنی قرآن
ہمنے اسلئے تم پر نازل کیا ہے۔ کہ تم دلائل بیّنہ سے
ان کے اختلاف مٹادو۔ اور ماننے والوں کے لئے
یہ کتاب موجب ہدایت اور رحمت ہے (دنیا جہان
پر رُوحانی موت وارد ہو چکی ہے) اللہ نے زمین
کے مرنے کے بعد اُسے زندہ کرنے کے لئے بارش
بھیجی ہے۔ سُننے والے غور کرلیں۔ ان کے لئے
یہ ایک دلیل ہے +

ان مقدس آیات کی تشریح کرنے سے پہلے میں
اوّل مسلمان مناظرین کو اور پھر عیسائی اور آریہ
مذہبی مُصنّفین کو اس پیارے اور دلکش قرآن کے
پیرایہ کی طرف متوجّہ کرتا ہوں۔ کہ کس طرح کسی
کے دل دُکھانے کے بغیر قرآن نے اصل مطلب
کو ادا کر دیا ہے۔ ترجمہ بالا میں اگر کہیں بھی
نا ملائمت نظر آئے۔ تو وہ میری بریکٹ دادہ تشریح
فقرات میں ہے۔ قرآن کے لفظوں میں نہیں جن کا
ترجمہ میں نے بریکٹ سے باہر دیا ہے۔ اِن آیات

میں قرآن نے اپنی وجوہ تنزیل بتلائی ہیں۔ نزول قرآن کے وقت لوگ بعض بد اعمالیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ جن کو انہوں نے اپنا مذہب بنا رکھا تھا۔ جس کی تشریح ہم آگے چلکر کریں گے۔ اسلئے الہام خداوندی کا فرض تھا۔ کہ ایسے موقعہ پر نازل ہوکر دُنیا کو اس غلطی سے نکالے۔ اب قرآن کریم اس آیت میں اپنے نزول کی ایک وجہ یہ تو بتلاتا ہے کہ لوگوں نے بدعملیوں کو اپنا مذہب بنا رکھا ہے لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ ان بدعملیوں کی تعلیم ان کے مذہب میں ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ ہم نے یعنے خدا تعالٰے نے ایک وقت اپنا مذہب ان کو بھیجا تھا یعنے ان کے ہاتھ میں جو مذہب ہے۔ وہ اپنی اصلی شکل میں تو خدا کی طرف سے تھا۔ جیسے ان کی طرف مبعوث ہوئے ہوئے رسول لائے تھے۔ لیکن آج یہ لوگ نہ ان رسولوں کی سُنن کو دیکھتے ہیں نہ مذہب حقہ کی تعلیم پر چلتے ہیں۔ بلکہ شیطان کے اشارہ پر زمانہ چل رہا ہے۔ حتےٰ کہ ان کے بُرے کام بھی انکی نگاہ میں خوبصورت ہو گئے ہیں۔ لہٰذا قرآن ان کے مذہب اصلی کا بطلان کرنے نہیں آیا۔ بلکہ یہ دکھلانے

آیا ہے کہ اس وقت جو ان کے ہاتھ میں بطور مذہب کوئی چیز ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ان کے ہادیوں کو نہیں ملی تھی۔ جو ان کے بزرگوں کو خدا تعالےٰ نے عطا کیا تھا۔ وہ وہ بُھلا چکے ہیں +

مَیں مانتا ہوں کہ آج بدقسمتی سے مسلمانوں میں بدعمل لوگ موجُود ہیں۔ مسلمان جیلخانوں میں سرکاری مہمان ہیں۔ طرح طرح کی غلط کاریوں میں وہ پھنسے ہوئے ہیں۔ بعض آریہ مصنفین مسلمانوں کی بدعملی کو اسلام کے بُطلان کرنے میں پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ تو نہیں کہتے کہ مسلمان قرآن چھوڑ کر بدعمل ہو گئے ہیں۔ بلکہ وہ ہمارے دل کو دُکھاتے ہیں۔ اور ارادتاً ہمارے جگر بیرحمی کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں جب وہ اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں۔ کہ قرآن نے چور بدمعاش۔ ڈکیت پیدا کیئے۔ ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہوتا۔ اگر قرآن میں ایسی تعلیمیں ہوتیں۔ کیا ان کی اپنی سوسائٹی بدکرداریوں سے خالی ہے۔ اُن میں قسم قسم کے فسق و فجور موجود نہیں؟ لیکن ہم ان کی بدچلنیوں کو ویدوں کی طرف تو منسوب نکرینگے بلکہ قرآنی طریق مذکورہ بالا کے مطابق یہی کہیں گے

کہ ان آریوں نے اس تعلیم کو چھوڑ دیا ہے۔ جو ان پر نازل ہوئی تھی۔ وہ نیوگ جیسی گندی تعلیم کو مذہب بنائے بیٹھے ہیں۔ اور اس بیحیائی کی تعلیم کو وید سے نکالنے کی کوشش میں ہیں لیکن ہمیں مقدس کتابوں کا پاس ادب ہے۔ اسلئے ہم یہی کہتے ہیں۔ کہ سوامی دیانند جی مہاراج نے وید کو سمجھا ہی نہیں۔ ورنہ وہ نیوگ کی تعلیم نہ دیتے۔ اور وید میں یہ گندی تعلیم ہرگز موجود نہیں +

یہ تو ایک درد کا اظہار تھا۔ جو بطور جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ قرآن نے ان تین آیات میں اپنے نزول کی تین وجہیں بتلائی ہیں۔

اول ۔ گو خدا تعالیٰ نے ہر ایک قوم کو مذہب دیا لیکن نزول قرآن پر کل رُوئے زمین ظلمت کدہ بن رہی تھی۔ حتےٰ کہ ہر ملک میں فسق و فجور کی یہ حد تھی۔ کہ لوگ بدی کو بدی سمجھتے ہی نہ تھے۔ بلکہ بدی نے تقدس کا جامہ پہن لیا تھا۔ جیسے قرآن نے ایک نہایت خوبصورت پیرایہ میں یُوں بیان کیا۔ کہ شیطان نے بدعملیوں کو لوگوں کی نگاہ میں خوبصورت کر رکھا تھا۔

ایسے وقت ضرور تھا۔ کہ خدا کی طرف سے نور نازل ہو کر دُنیا سے اُس ظلمت کو مٹا دے +

دوئم۔ امر بالا کے بالکل برعکس دنیا نے اپنے مذہب کو اپنے لئے عذاب بنا رکھا تھا +

سوئم۔ صداقت دو وجہیں نہیں ہوتی۔ مذہب اگر خدا کی طرف سے آیا تھا۔ تو خواہ وہ کسی مُلک میں ہو۔ اسکی ایک ہی شکل ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کے وقت اور ایسی ہی آج بھی نہ صرف ایک مذہب والے دوسرے کے مخالف تھے۔ بلکہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقے ایکدوسرے کے برخلاف تعلیم دیتے تھے +

یہ تینوں باتیں اِس امر کی مقتضی تھیں کہ خدا کی طرف سے مذہب حق ظاہر ہو کر دُنیا کو غلطیوں سے پاک کرے۔ زمین مرچکی تھی۔ اور ضرور تھا کہ آسمان سے باران رحمت ہو۔ تا کہ زمین از سر نو زندہ ہو۔ ان ہرسہ امُور کو اب ہم بالتفصیل لکھتے ہیں :-

گبن اور ایسے ہی یورپ کے دوسرے مورخین ایام وسطی نے اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ کہ یورپ کی پانچویں چھٹی صدی اخلاقی نگاہ سے ایک بدترین زمانہ پیش

کرتی ہے۔ اور بعثت اسلام کا بھی یہی وقت تھا۔ دوسری طرف جو کچھ ان لوگوں نے یورپ کے متعلق لکھا ہے وہی ایران۔ ہندوستان۔ عرب۔ شام۔ سیریا۔ الغرض ہر ایک ملک کے متعلق صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے بدی تو ہر ملک اور ہر زمانہ میں موجود ہوتی ہے۔ اور شیطان کی حکومت کا کُلّی خاتمہ شاید قیامت سے پہلے نہ ہو۔ لیکن بعثت اسلام ٹھیک اس وقت ہی جب شیطان کی حکومت کُل دُنیا میں اپنے عروج پر تھی۔ آج بھی بدکار ہیں۔ لیکن وہ بدی کو بدی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اپنے اعمال شنیعہ سے یہ لوگ بعض وقت نادم بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اُس زمانہ کے لوگ امور بد کو نیکی اور حسن عبادت سمجھ کر اختیار کرتے تھے۔ اس حقیقت کو قرآن نے نہایت ہی فصیح لفظوں میں ادا کیا ہے جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ وزین لھم الشیطن اعمالھم۔ شیطان نے ان کی نگاہ میں ان کے عملوں کو خوبصورت کر دکھایا ہے۔ اس زمانہ کا لٹریچر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدی کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی۔ جو اپنی انتہا کو نہ پہنچی ہو۔ قمار بازی پر اپنی عورت کو ہار دینا یہ اسی

وقت کی شان تھی۔ میری طبیعت مجھے اجازت نہیں دیتی۔ کہ میں ان اوراق کو اس زمانہ کی تفصیلات بد سے خراب کروں۔ میں صرف ایک ہی بدی کا مثال کے طور پر یہاں ذکر کرونگا۔ وہ بدی بھی وہ بدی ہے۔ جسے شریعت اسلام نے قتل کے بعد سنگین سے سنگین گناہ قرار دیا ہے۔ یعنی مرد اور عورت کا ناجائز تعلق۔ جس طرح قتل مقتول کی خانہ بربادی کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح زنا بھی ایک خاندان کی تباہی کا سبب ہو جاتا ہے۔ عربی زبان میں فساد سے پہلے معنی یہی ہیں۔ چنانچہ پیدائش آدم پر فرشتوں نے قتل کے ساتھ جو فساد کا ذکر کیا (یفسدون فی الارض و یسفک الدماء) اس سے اکثر مفسرین نے مراد زناکاری ہی لی ہے۔ الغرض اس زمانہ میں کیا خشکی کے رہنے والے کیا جزائر کے رہنے والے کل کے کل اس فساد کے شکار ہو رہے تھے۔ اسی کی طرف خدا کے الفاظ ذیل ضرورت قرآن بیان کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں۔ ظھر الفساد فی البر والبحر یعنی خشکی تری ہر جگہ فساد ہی فساد قائم ہو چکا ہے

یہ مضمون کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرنے کے قابل نہیں۔ ہندوستان کیلئے صرف اسی قدر کہدینا کافی ہے۔ کہ یہ پُرانوں کا زمانہ تھا۔ کسی ملک یا قوم یا وقت کے اخلاق کا اندازہ لگانے کا آسان سے آسان طریق یہ ہے۔ کہ انسان اُن امور پر غور کرے۔ جو وہ زمانہ یا ملک زیر بحث اپنے معبودوں یا مقدس انسانوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ایسا ہی بعض وقت ان کے معبد اور مندر اپنے اندر ایسی چیزیں رکھتے ہیں۔ جو معاملہ میں کافی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ کیونکہ مذہب ہی ہر جگہ سرچشمہ اخلاق مانا گیا ہے۔ اور اگر مذہبی پیشواؤں کے متعلق کسی قوم کی تاریخ یا حکایات کوئی بیان کریں۔ یا کوئی بات مذہبی مقدس جگہوں میں نظر آئے تو وہ باتیں بالضرور اس قوم کے نزدیک اس خاص وقت پر عمدہ اور اعلےٰ اخلاق سمجھی جاتی ہونگی۔ قریباً کل کے کُل پُرانی قصوں میں مقدس انسانوں کا تعلق نامحرم عورتوں سے نظر آتا ہے بعض مقدس انسانوں کی ولادت بھی ایسے ہی تعلقات کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ میرے نزدیک سب کے سب جھوٹے

قصے ہیں۔ اور ان بزرگ انسانوں پر لائبل ہیں جنکی میں دل سے عزت کرتا ہوں لیکن ان قصّوں کے تراشنے والے ہرگز یہ امور اپنے بزرگوں کے متعلق بیان نہ کرتے۔ اگر یہ باتیں اس زمانہ میں مقدس نہ سمجھی جاتیں۔ کرشن کی لیلا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اس انسان کی شان پر ایک دھبّہ ہے۔ جس کے پاک لبوں پر بھاگوت گیتا جیسا مقدّس کلام جاری ہؤا۔ رامچندر جیسے مقدّس و مکرّم انسان کی پیدائش میں رشا یہ برہمن کو لے آنا۔ یہ سب افترا و بہتان ہے۔ لیکن یہ اس زمانہ کا نقشہ ہے اس زمانہ کے مندر بھی کچھ اسی قسم کے نظر آتے ہیں۔ آج بھی اس زمانہ کا بچا کھچا ایک نمونہ بنارس شہر میں موجود ہے جسے میں نے خود جاکر دیکھا۔ گنگا کے کنارہ پر کسی قدر مرتفع جگہ پر لکڑی کا بنا ہؤا ہے۔ جب ہم چند قدم ایک پہاڑی نما جگہ پر چڑھے تو وہاں ایک سائن بورڈ پر انگریزی میں یہ لکھا ہؤا تھا "عورتوں کو اندر جانے کی ممانعت ہے" اس نوٹس کو پڑھ کر ایک حد تک تو ہم تیار ہو گئے تھے کہ ہمارے سامنے کیا آنیوالا ہے۔ لیکن مندر میں پہنچ کر

بھی لکڑی کی کھدائی کا بہترین نمونہ تو نظر آیا لیکن وہ فن تو مطالب کوک شاستری کی تشریحی تصویریں بنانے میں خرچ ہؤا ہؤا نظر آیا۔ مگر ظلم تو یہ ہے کہ اس کا نام مندر یعنے خدا کا گھر ہے۔ اور اس کی اس حیثیت آلات کو صرف اسی طور پر پورا کیا گیا ہے۔ کہ ہر فحش تصویر کے سر پر ایک خدا کا اوتار کھڑا کر دیا ہے۔ مثلاً رامچندر۔ کرشن۔ نرسنگ اوتار وغیرہ وغیرہ العیاذ باللہ آلات توالد وتناسل کی پرستش نے بھی فن کھدائی کے اعلےٰ نمونے پیدا کر رکھے تھے۔ جہاں صرف لنگ نہیں جیسے عام ہندوستان کے گلی کوچوں میں نظر آتا ہے۔ بلکہ ایک پورا انسان کا ہر حصہ جسم کے طور پر صنف کمزور کا تصویر آ معبود و معبود بن رہا تھا۔ یہ نیپالی مندر پرانک زمانہ کی ایک زندہ تاریخ ہے۔ خدا کا گھر اور وہاں ان امور کا ہونا۔ فصدق اللہ تعالیٰ فزین لھم الشیطٰن اعمالھم۔ شیطان نے ان کی نگاہ میں یہ اعمال خوبصورت کر دیئے۔ ورلا ان امور کے ذریعہ عبادتگاہوں کو خوبصورت بنانا انسانی نقل میں نہیں آسکتا۔ بالمقابل آج کل کے

کسی مذہب کے معبد گاہ میں چلے جاؤ۔ انکی دیواروں پر جو تصاویر یا فقرات لکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ وہ انسان میں نیکی کے جذبات کی تحریک کرتے ہیں اس سے صاف پایا جاتا ہے۔ کہ پرانے زمانہ کے مندر میں جو اس قسم کی تصویریں رکھی جاتی تھیں۔ تو جن امور کو یہ محرک کرتی ہیں۔ وہ اس زمانہ میں نہ صرف بدی ہی نہ سمجھی جاتی تھیں۔ بلکہ لوگ انہیں نیکی اور پارسائی کے رنگ میں دیکھتے تھے۔ دل نہیں چاہتا۔ کہ ان چند سطور سے زیادہ میں ہندوستان کے حالات یہاں لکھوں۔ وہ زمانہ انسانی غلط کاری کا ایک بدترین زمانہ تھا۔ جس پر اُس زمانہ کا قانون وراثت وولادت اور قانونِ زوجیت شاہد حال ہے ؂

ہندوستان کے بالمقابل ایرانیوں کو بھی ہمیشہ اپنی تہذیب پر ناز رہا ہے۔ لیکن فساد اپنی مذکورہ بالا معنوں میں ہر جگہ دائر وسائر تھا۔ رچرڈسن نے اپنی لغت فارسی کے دیباچہ میں اس حملہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو غلط اور بیجا طور پر مسلمانوں پر ہمیشہ جاہل مخالفوں نے کیا ہے۔ یعنی مسلمانوں نے ایران

میں بھی کُتب خانہ کے کُتب خانہ جلا کر حمام گرم کئے وہ لکھتا ہے۔ کہ اگر مسلمانوں نے ایسا کیا بھی تو اچھّا کیا۔ اُنھوں نے ان کتب خانوں کو حوالہ آتش کر کے فسق و فجُور کے بدترین لٹریچر کو دُنیا سے مٹا دیا یعنی اس کتب خانہ کی کتابیں فی الجملہ کوک شاستر کی ہی تشریحات تھیں۔ بعثت اسلام کے وقت ایرانی مذہب زرتشت نے مزدکی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جس کے ماتحت ایک پیشوائے مذہب کو حق پہنچتا تھا۔ کہ کسی مُرید کے گھر میں جا کر خاندان کے ممبران ماناث میں سے جسے چاہے اپنی خدمت میں لے لے۔ اور یہ امر اس خاندان کے لئے باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ آج ہندوستان میں بم مارگ کے پرستار۔ اس ملک کے ہر حصّہ میں موجود ہیں ان میں بھی کم و بیش یہ ہی باتیں نظر آتی ہیں۔ خود بمبئی کا رکما بائی والا مقدّمہ بھی اسی شیطانی تو زین اعمال کی ایک تشریح ہے۔ اس مقدمہ میں بمبئی ہائیکورٹ نے جس رسم بد کو توڑا۔ وہ یہ تھی کہ اس کے ماتحت نوعروس کو پہلی دو تین راتیں پیشوائے مذہب کے گھر میں کاٹنی ہوتی تھیں۔ رکما بائی

اور اس کے خاوند نے اس مذہبی رواج کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ جس پر پیشوائے مذہب نے عدالت سے اس رواج کے نفاذ کی ڈگری چاہی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں میں کس قدر احساس اخلاق کمزور ہے۔ آج پندرہ سو برس اس زمانہ پر گذر گئے۔ جس کی باقیات یہ شاکتک مذہب اور بام مارگ مذہب ہے۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے۔ کہ وہ زمانہ کس قدر تاریک ہوگا +

نوشیروان کے باپ کا دربار ایکدن مزدکی جذبات کی ایک عجیب وغریب نمائشگاہ بن گیا۔ اس وقت نوشیروان نوعمر تھا۔ پیر مزدک دربار میں آیا جہاں والدہ نوشیروان کی خوبصورتی نے پیر مزدک کو اپنے حقوق مسلمہ کے نفاذ پر آمادہ کیا۔ اور اس نے چاہا۔ کہ وہ اپنے جسمی توسل سے اس خاندان کو مورد برکات کردے۔ والد نوشیروان تو اس مرید اعظم کے ارشاد پر عمل کرنا اپنی نجات اخروی سمجھتا۔ لیکن نوشیروان کی بالک ہٹ کام کر گئی۔ اس نے باپ کے حکم کی مخالفت کی۔ اور اس طرح اس شہزادی کی

عصمت محفوظ رہی +
یورپ کا حال بھی اس وقت اسی رنگ میں رنگین تھا۔ اس وقت کی توبہ گاہیں عمارت گرجا کے تاریک ترین حصوں میں ہوا کرتی تھیں لیکن آج انہیں گرجا کے وسط میں عین عبادتگاہ کے مقابل جگہ دیجاتی ہے۔ جہاں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ آجکل کوئی عورت توبہ گاہ کے اندر نہیں جانے پاتی۔ ایک ربڑ کی نلکی کے ذریعہ پادری میں اور توبہ کرنیوالی میں باتیں ہوتی ہیں۔ پادری توبہ گاہ کے اندر بیٹھتا ہے۔ جس پر کوئی سقف نہیں ہوتی۔ اور اس کے دروازہ بھی شیشہ کے ہوتے ہیں۔ اور توبہ کنندہ اس کے باہر عام نگاہ میں بیٹھتا ہے۔ جدید توبہ گاہوں میں اس حزم و احتیاط کا برتنا ان سیہ کاریوں کا پتہ بتاتا ہے جس کی روک تھام کرنا تو ایک فعل محمود ہے۔ لیکن جس کسی مذہب نے توبہ قبول کرنے کے لئے خدا کی جگہ کسی انسان کو خدا کا قائم مقام مقرر کیا۔ اس نے گناہ کا دروازہ کھول دیا۔ کسی مرد یا عورت کا کسی اور انسان کے سامنے اقرار گناہ کرنا گویا اپنی عزت و

شہرت کو اس شخص کے رحم پر چھوڑ نا ہے۔ تر بہ لینے والا اس طرح توبہ کنندہ کی کمزوری سے واقف ہوکر اس کمزوری کو طشت ازبام کرنے کی دھمکی سے جو چاہے توبہ کنندہ سے کرائے۔ اسی پر غالباً انگریزی مصنف لیمب نے کیا سچی بات کہی ہے۔ کہ یہ عورتیں توبہ خانوں میں ایک گناہ کی توبہ کرنے ہوئے اور گناہوں کی مرتکب ہو جاتی ہیں +

فساد کا بدترین نمونہ عرب میں تھا۔ اگر شیطان کے ڈپٹی اور ایجنٹ اور وائسرائے اسوقت دوسرے ممالک میں حکمران تھے۔ تو وہ خود بعثت نبوی سے پہلے عرب میں حکومت کر رہا تھا۔ اس فساد کا انتہائی مقام یہ تھا۔ کہ ایک عرب اس عورت کے سوا جس کے بطن سے وہ نکلا ہو باقی تمام عورتوں کو اپنی زوجیت میں لے آتا تھا۔ قرآن کی یہ آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حرمت علیکم امھاتکم و بنٰتکم و اخوٰتکم۔ آج تم پر تمہاری مائیں خالائیں پھوپیاں وغیرہ وغیرہ حرام کر دیگئیں +

اب مقام غور ہے۔ کہ اگر نور مذہب دنیا میں تاریکی کو دور کرنے آتا ہے۔ تو پھر ہمیں تو تاریخ

عالم میں بعثت نبوی کے وقت سے زیادہ تر تاریک زمانہ نظر نہیں آتا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ خدا کا نور آسمان سے نہ اُترتا۔ کسی پیغمبر کی تاریخ اُٹھا کر ان واقعات پر غور کرو۔ جن کے وجود نے اس وقت اس نبی کے ظہور کی ضرورت پیدا کر رکھی تھی۔ پھر تم کو نظر آجائیگا۔ کہ شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے وقت جو باتیں کُل دُنیا میں پیدا ہو رہی تھیں وہ کئی گُنا اس ضرورت سے زیادہ تھیں۔ اور کُل دُنیا کے لئے ایک زبردست نورِ نبوّت کو چاہتی تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک عظیم الشان نبی اس وقت پیدا نہ ہوتا۔

وشنو پران نے ہندو اوتاروں کا وقت نزُول ہمیشہ زمانہ ظلمت ٹھیرایا ہے۔ لیکن کسی اوتار کا زمانہ دیکھ لیا جائے۔ وہ ظہورِ مصطفوی کے وقت سے سیہ کاری میں کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ جس وقت زمین پر پاپ۔ ادھرم پھیلجاتا ہے۔ وشنو دھرتی کو اس سے پاک کرنے کے لئے کسی رُوپ میں آ ظاہر ہوتے ہیں۔ اور زمین کو ناپاکیوں سے پاک کر دیتے ہیں۔ بھاگوت گیتا

ہیں خدا کی طرف سے بولتے ہوئے کرشن بھی اپنے
ظہور کا وقت یہی بتلاتے ہیں۔ علامہ فیضی
نے ان کے الفاظ ذیل میں ترجمہ کئے ہیں:-

چو بنیادِ دیں سست گردد بسے
نمائیم خود را بہ شکلِ کسے

قرآن نے بھی اپنے نزول کی ساری وجہ یہی
بتلائی ہے۔ چنانچہ ظھر الفساد فی البر
والبحر کہ کر یہ فرمایا۔ اعلموا ان اللہ یحی الارض
بعد موتھا۔ جان لو اللہ تعالیٰ زمین کے مرجانے
پر پھر اسے زندہ کرنے لگا ہے۔

مجھے بسا اوقات انسانی تعصبات پر حیرت
آجاتی ہے۔ کوئی ہندو بھائیوں سے دریافت
کرے۔ ایک طرف تو کرشن کے الفاظ کی تمہارے
دلوں میں اس قدر عزت ہے۔ کہ اس کا نام تمہاری
نجات ہے۔ پھر وہ کس زور سے اپنے ظہور کا
اپنے وقت زور دیتا ہے۔ کہ جب زمانہ میں بدمعاشی
اور پاپ بڑھجاوے۔ پر انک زمانہ سے بہتر اور
کونسا زمانہ کرشن کے ظہور کا ہوگا۔ کہ جب خود
اس کا مقدس نام اور مقدس وجود بداخلاقی کے

خصّتوں سے مُلوّث کر دیا گیا۔ پھر اگر اس وقت کرشن نے ہندوستان میں ظہور نہیں کیا اور ہندو لوگ اس کے ظہور کو عرب میں نہیں مانتے تو پھر کرشن کے الفاظ غلط ثابت ہوتے ہیں+ ان تمام واقعات کو سامنے رکھ کر میں یہہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اگر آنحضرت صلعم کی یا قرآن کی زمانہ کو ضرورت نہ تھی تو پھر کسی نبی یا کسی الہام کی زمانہ کو ضرورت نظر نہیں آتی۔ کسی نبی یا کسی مذہب کو لیلو جو وجود اس کی ضرورت نے ظہور میں کوئی شخص دے سکتا ہے۔ وہ سوگنا رنگوں میں بعثت نبوی کے وقت موجود تھے اور جس شیطان کی زینت اعمال کا ذکر قرآن نے کیا ہے وہ تو تاریخ عالم میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ بدی تو آج بھی ہے پھر تنزیل قرآن نے آکر زمانہ میں کیا کیا۔ کل دنیا کی تاریخ ارتقاء اخلاق کو بحیثیت مجموعی ایک شخص سامنے رکھ کر اس امر پر غور کرے تو اسّے آنحضرت صلعم کا وجود اس تاریخ میں بلند سے بلند مقام پر نظر آئیگا۔ بدی کو نیکی

اور عبادت سمجھے جانے کے مقام سے نیچا گرا کر اس مقام پر لے آنا جہاں بدی بدی سمجھی جائے گویا مشکل سے مشکل مرحلہ تہذیب انسانی کو طے کرا دینا ہے۔ احساس بدی ہی آہستہ آہستہ اسکی روک کا موجب ہو جاتا ہے۔ تاریخ عالم میں یہ کام شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہُوا۔ جو امورِ شنیعہ پبلک میں ہوتے تھے۔ وہ آج کوٹھڑیوں میں ہوتے ہیں

آیت بالا میں جو دوسری وجہ نزول قرآن کی بتلائی گئی ہے۔ اس کی طرف اس کے اگلے الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔ دھو ولیھم الیوم ولھم عذاب الیم۔ مذہبًا شیطان ان کا ولی ہو رہا ہے اور آج مذہب ان کے لئے ایک عذاب بنگیا ہے بعثت نبوی پر کل زمانہ نے نجات اخروی کیلئے جو عبادات تجویز کی تھیں۔ وہ نہایت ہی خطرناک عذاب تک پہنچی ہوئی نفس کُشیاں تھیں۔ ہاتھوں کو کھڑا رکھ کر خشک کر لینا۔ سُورج کو دیکھتے دیکھتے اندھا ہو جاتا۔ آہنی سلاخوں کا بستر بنا کر اُس پر سونا۔ جگنناتھ کے رتھ کے پہیوں تلے گردنیں دیدینا۔ دیویوں کے سامنے زبانیں کاٹ کر دھر دینا

جل پروا کرتے ہوئے زندہ بچوں کو گنگا مائی میں بہا دینا گنگا مائی کے کنارہ پر مرنے کے لئے موت سے پہلے اپنے اقربا کے ہاتھوں من وجہ دم واپسیں تک پہنچنا۔ موسم سرما میں برفانی پانی میں کھڑا ہونا۔ ایام گرما میں پنچ اگنی میں پرستش کرنا۔ الغرض کن کن عبادتوں کو گنا جائے۔ قرآن نے فی الجملہ ایک بات کہ کر حقیقت حال کو آشکارا کر دیا۔ ولھم عذاب الیم۔ یہی حال ہر جگہ تھا۔ تارک الدنیا مرد و عورت راہبوں کی زندگی بھی ایک عذاب تھی چھ چھ ماہ چھوڑ عمر بھر غسل نہ کرنا جسمانی خواہشوں کو مارنے کے طرح طرح کے راستے نکالنا۔ ولھم عذاب الیم کی ہی تفسیریں تھیں۔ اس کے علاوہ دنیوی معاملات میں خطرناک رسم و رواج جو شادی غمی یا ایسی قسم کے دیگر مواقعات پر بطور مذہب ادا کئے جاتے تھے۔ اور جس کا بقیہ آج بھی ہندوں میں اور ان کے دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔ یہ سب کے سب وہ بوجھ ہیں جس نے انسان کی گردن کو دبا رکھا تھا۔ اور اس سے آکر اسلام نے ہی آزاد کیا۔ انا جعلنا فی اعناقھم اغلالا لگے تھے

الی الاذ فان نھم مقمحون - یہی وہ اغلال رسم ورواج ہیں +

تیسری اور آخری وجہ جو قرآن نے اپنے نزول کی آیت بالا میں بتلائی ہے - وہ وہ اختلاف عظیم تھا - جو اوّل مختلف مذاہب میں آپس میں پھر کسی مذہب کے خود مختلف فرقوں میں بعثت اسلام کے وقت دُنیا کے کُل مذاہب میں موجود تھا - اور گو آج بھی بہت حد تک اس سے دُنیا خالی نہیں مذہب تو تربیت رُوح کیلئے خدا کی طرف سے آتا ہے اور کل دُنیا کے دل ودماغ ایک ہی وضع پر پیدا ہُوئے ہیں - پھر مذہب اور اس کی تعلیم سب جگہ ایک ہی نہو تو وہ خدا کی طرف سے نہیں - لیکن مذاہب مختلفہ ہیں جو خطرناک اختلاف اسوقت بھی ہے - اس کو اگر الگ بھی رکھ دیا جائے - اور کسی بڑے مذہب کو لیلیا جائے - تو اس کے ماتحت فرقہائے مختلفہ میں جو مشرق ومغرب کا فرق نظر آتا ہے - وہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے - کہ یہ مذہب اپنی اصلی شکل میں نہیں رہے - دالا صداقت ذووجہین نہیں ہوسکتی - اس کا تو ایک ہی پہلو ہے

پھر کسی مذہب کا اختلاف کیا معنے رکھتا ہے۔
یہ اختلاف ہی تحریف مذہب کا ثبوت ہے۔ مثلاً
عیسائی مذہب کو لیلنا جائیے۔ رومن کیتھولک تین
خداؤں کے سوا جناب مریم کو بھی معبودیت کے تخت
پر بٹھاتے ہیں۔ اور پوپ کو معصوم عن الخطاء
سمجھتے ہیں۔ بالمقابل پروٹسٹنٹ صرف باپ بیٹا
رُوح القدس تک الوہیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور
کیا مزہ کی بات ہے کہ کیتھولک فرقہ کو طنزاً بت پرست
اور پرستار مریم کہتے ہیں۔ اور پوپ کو معصوم
عن الخطاء نہیں جانتے۔ پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کے
نیچے صدہا فرقے ہیں۔ مثلاً بپٹسٹ رسم بپتسمہ کو رسم
نہیں بلکہ حقیقت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ تو دریائے
یردن کے پانی کے سوا بپتسمہ ہونا ہی غلط سمجھتے ہیں
بعض کے نزدیک بپتسمہ پانے کے بغیر کسی بچہ کا مرجانا
اُسے نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ دوسروں کے
نزدیک یہ ایک رسم ہے۔ نماز کی ادائیگی کے متعلق
بعض کے نزدیک گرجا کا ہونا پادری کا
خاص لباس پہننا اس کا خاص سند یافتہ ہونا
اس قدر ضروری ہے۔ کہ ان میں سے ایک چیز کی کمی

پر بھی اتوار کی نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ عشاء ربانی میں بعض کے نزدیک شراب اور روٹی حلق سے اُترتے ہی مسیح کا خون اور گوشت ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح عشاء ربانی میں حصہ لینے والے کے جسم میں مسیحی خون وگوشت کے اجزاء پیدا ہو کر اس کا مسیح سے توصل پیدا کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ اور مسیح اس وقت ایک ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام ہولی کمیونین یعنی مقدس اتحاد رکھا گیا ہے۔ دوسروں کے نزدیک عشاء ربانی کی یہ حقیقت نہیں جناب مسیح کے آخری عید فسح منانے کی یہ یادگار ہے۔ الغرض عیسائی مذہب میں اس وقت پانسو کے قریب فرقے ہیں۔ مشکل تو یہ آن کے پڑتی ہے کہ ان میں اختلاف مسلمانوں کے فرقہ جات کی طرح فروعی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ جن باتوں میں ان فرقوں کا آپس میں اختلاف ہے۔ وہ نجات کیلئے ضروری باتیں ہیں۔ اور ان کے نہ ماننے پر انسان عیسائیت سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ ان سب کے مقابل ایک فرقہ عیسائیوں کا وہ ہے جو مسیح کو صرف پیغمبر مانتا ہے۔ جسے یونی ٹیرین کہتے ہیں +

دوسری طرف ہندو مذہب کا بھی یہی حال ہے
اس کے فرقہ ہائے مختلفہ بھی ایکدوسرے سے اصولی
اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً آریہ سماج اور سناتن دھرم
کو دیکھ لیا جائے۔ ایک طرف مورتی کا کھنڈن۔
دوسری طرف اسی کا منڈن ایک طرف بعض بزرگوں
کو خدا کا اوتار ماننا۔ دوسری طرف نہ صرف
ایسا ہی نہ سمجھنا۔ بلکہ ان کے افعال پر نکتہ چینی
کرنا۔ ایک طرف برہم بھوج کو جزو مذہب سمجھنا
دوسری طرف اسے پانڈوں کا ظلم قرار دینا۔ پھر
مسئلہ تناسخ اور اس کی مختلف شاخیں۔ پھر مادہ
کا قدیم یا مخلوق ہونا۔ پھر صدہا قسم کے بیراگ اور
یوگ۔ الغرض جتنے ہندو مذہب کے دیوتا ہیں شاید
اتنے ہی یہاں مذہب ہونگے۔ بُدّھ مذہب بھی
تین بڑی شاخوں پر منقسم ہے۔ وہاں بھی اختلاف
اصول ہی ہے۔ مثلاً بعض ایک ہستی کے قائل ہیں
جسے خدا کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے اس ہستی کے قائل
نہیں۔ پھر جو اس ہستی کے قائل ہیں۔ ان کی آگے
دو قسمیں ہیں۔ وہ جو اس ہستی کا اس دُنیا سے
تعلق مانتے ہیں۔ اور دوسرے جو اس ہستی کا اس

سے تعلق نہیں مانتے ۔ پھر جو اس وقت خصوصاً برھما
میں بُدّھ مذہب کی دائرہ سائر شکل ہے ۔ اسکے ماتحت
بدھ کو معبود ہونے کا حق دیدیا گیا ہے ۔ اسے دعاؤں کا
مخاطب اور مسجُود کیا جاتا ہے ۔ بعض کے نزدیک یہ گویا
مذہب کی رُوح رواں ہے ۔ دوسروں کے نزدیک
یہ اعمال چند ان مذہبی حیثیت نہیں رکھتے ۔ بلکہ
ایک رُوحانی کیفیّت کو دل میں پیدا کر دیتے ہیں +

الغرض اگر مذہب تربیت روح کیلئے جیسے کہ اوپر
بیان ہُوا ہے خدا کی طرف سے آتا ہے ۔ تو ہر جگہ
اصُولاً اسکی ایک ہی شکل ہونی چاہئیے تھی ۔ اگر مقامی
خصُوصیّات نے اس پر اپنا رنگ بھی چڑھایا تھا ۔ تو
اُسے فروعات سے تعلق ہونا چاہیئے تھا ۔ نہ کہ اصل
اصُول سے ۔ یہ امر ممکن ہے کہ مذاہب مختلفہ میں بعد
مکان وزمان نے یہ ہم آہنگی ماردی ہو ۔ جو یقیناً
ابتدا میں تھی ۔ لیکن ایک ہی مذہب کی مختلف شاخوں
میں تو اصُولاً اتفاق ہونا چاہیئے تھا جیسے کہ اسلام
میں ہے ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی مذہب کی
مختلف شاخوں میں اس قدر اختلاف عظیم ہو ۔ کہ
ایک فرقہ دوسرے کو دائرہ مذہب سے خارج سمجھے ۔ مذہب

ایک صداقت ہے۔ اور کسی صداقت کی دو شکلیں نہیں ہو سکتیں۔ اگر عیسائی مذہب خدا کی طرف سے ہے۔ تو پھر اس کے کُل فرقہ جات تو صداقت کے مالک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان میں اصولی اختلاف ہے۔ یا عیسائی موحد سچے ہونگے یا تین خداؤں کے پرستار یا الوہیت مریم ایک ضروری ہو گا۔ یا مریم کو خدا بتانیوالے کافر ہونگے۔ آخر جس منطق سے مسیح خدا ٹھہرتے ہیں۔ اسی منطق سے ان کی ماں بھی خدا بن سکتی ہے۔ پوپ کے متعلق بھی اس کا معصوم عن الخطاء ہونا یا اس کے غیر ہوتا۔ ان دو امور میں سے بھی ایک ہی بات سچی ہو سکتی ہے۔ اور باتوں کو چھوڑکر یہ امر قابل غور ہے۔ کہ اگر ان مبینہ امور میں سے بعض امور تعلیم ربانی ہیں۔ کیونکہ کل کے کُل تو نہیں ہو سکتے۔ اس امر کے فیصلہ کرنے کا حق خدا تعالےٰ کے سوا اور کس کو پہنچتا ہے؟ جس خدا نے کسی پہلے وقت ان صداقتوں کی تعلیم کرنیکی ضرورت سمجھی۔ اور اس کے معلم اپنے رسول ٹھیرائے اسے اب کیا ہو گیا۔ کہ وہ صداقتوں کے مخلوط ہو جانے پر خاموش بیٹھ رہا۔ اس کا فرض ہے۔ کہ پھر کوئی نیا معلم

یا رسول اپنی طرف سے ان اختلاف کو مٹائے۔ اور دلائل بینہ سے صحیح تعلیم کو ہر مذہب و ملّت میں قائم کرے مجھے یہ سمجھ نہیں آتا۔ کہ جس صورت میں ہر مدّعی مذہب حقّہ اس بات کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ ہر مذہب کی تعلیم خدا کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وہ اگر ایسا نہ مانتے تو اس کا اپنا مذہب خدا کی طرف سے نہیں ٹھیرتا۔ وہ کیوں مذہب کے بگڑنے پر اسکی تصحیح خدا کی طرف سے ہونی تسلیم نہیں کرتا۔ جس صورت میں اصلی تعلیم بگڑ چکی ہے۔ اور اس بات پر ہر مذہب میں فرقوں کا پیدا ہو جانا۔ اور ان کا اصولاً ایکدوسرے کے برخلاف ہونا شاہد ہے۔ اگر کوئی انسان ایک منٹ کیلئے بھی یہ تسلیم کر لے کہ مذہب خدا کی طرف سے ہی آتا ہے۔ تو پھر اُسے یہ بھی ماننا پڑیگا۔ کہ مذہب بگڑ کر اصلاح بھی خُدا کے ہاتھ سے ہی پاتا ہے۔ بعثت نبوی پر کل مذاہب میں اختلاف تھے۔ اسلئے ضرور تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی ربّانی معلم مبعُوث ہو۔ وہ خدا کی طرف سے علم پاکر اُن اختلافات کو مٹائے۔ چنانچہ آیت زیر بحث کا آخری حصّہ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وما انزلنا الیک الا لتبین لھم الذی

اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون
ہم نے یہ کتاب اسی لئے تم پر نازل کی ہے - کہ تم امعاملات مذہب میں اختلاف کرنے والوں پر بدلائل مبیّنہ امرِ حق روشن کر دو - پھر یہ کتاب مومنین کیلئے رحمت اور راہ ہدیٰ ہو جائیگی - یہ آیت چنداں تفسیر کی محتاج نہیں - اس کی تشریح سطور بالا میں ہو چکی ہے -

الغرض جیسے کہ قرآن نے اپنا نام مہیمن تجویز کیا ہے - بعثتِ نبوی پر اور اب بھی دنیا کو ایک کتاب مہیمن کی ضرورت تھی - جو خدا کی طرف سے نازل ہو - کُل مذہبی اختلافات کا فیصلہ کرے - کہ مسیح ایک رسول اور انسان تھا - اور اس سے کوئی امر ایسا سرزد نہیں ہؤا - نہ اسکی حالت میں کوئی ایسا امر پایا جاتا ہے - جو دوسرے انسانوں میں نہ ہو - اسلئے وہ خدا نہیں - اسلئے فرقہ مُوحدین تم میں صحت پر ہے - پوپ مصئون عن الخطا نہیں ہو سکتا - وہ انسان ہے - بپتسمہ ایک رسم ہے - اور بہترین بپتسمہ صبغۃ اللہ ہے جسے اسلام لایا - ہندوستان کے مذاہب کو مخاطب

کرکے بدلائل بتلائے۔ کہ خدا خالق کائنات ہے مادہ اور ارواح فانی اور مخلوق ہیں۔ تناسخ غلط ہے۔ صعود انسانی کے مختلف منازل سے تمہیں دھوکہ لگا ہے۔ برہم بھوج کوئی شے نہیں۔ اوتار صرف مقدس اور ہادی انسان ہیں خدا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا عجیب اور معجز نما بات ہے۔ کہ آج کسی مذہب غیر کو لیلو۔ اگر اسکی کسی ایسی تعلیم پر جو خلاف تعلیم قرآن ہو۔ اگر ہم جرح قدح کرنی چاہیں۔ تو ان سب کا مصالحہ معہ دلائل بینہ قرآن سے نکل آتا ہے۔ بیشک جسکی مرضی ہو وہ دنیا کے کسی عقیدہ کو لے کر اسمیں ہمارا امتحان کر لے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ قرآن آخری صحیفہ اور کتاب مہیمن ہے +

ان نادان مسلمانوں کیخدمت میں اب مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ جو محض ناواقفیت اور عدم علم کے باعث زیادہ تر اور کہیں کہیں نفسانی اغراض کے باعث اسلام میں فرقی اختلافات کو اہمیت دیتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب موسوم بہ "اسلام میں کوئی فرقہ نہیں" میں ان امور

پر مفصّل بحث کی ہے۔ یہاں ہم صرف اسی آیت کو ایسے اصحاب کے آگے بھی پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جس منطق کو قرآن نے اور اسکی اتباع میں ہمنے کل مذاہب دیگرہ کے مقابل ضرورت قرآن ثابت کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ اسے ہم آپ کے مقابل پیش کرتے ہیں۔ اس منطق کو قرآن نے تاللہ لقد ارسلنا الی امم من قبلك سے شروع کر کے الفاظ بالا پر ختم کیا ہے۔ یعنی کُل قوموں کے رسول ہماری طرف سے آئے۔ ہم نے ہی تعلیم بھیجی۔ اسمیں اب اختلاف ہو گیا ہے۔ اس اختلاف کو مٹانے کیلیے ہم قرآن کو نازل کرتے ہیں۔ گویا خدا کی طرف سے آئے ہوئے مذہب میں اختلاف کا پیدا ہونا کسی اور کتاب کے پیدا ہونے کا مُوجب ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن کے نازل ہونے کے بعد بھی قرآن کے ماننے والوں میں اختلاف عظیم ہو تو پھر منطق بالا کی رُو سے قرآن آخری کتاب نہیں ٹھیرتا۔ مسلمانوں کو دو باتوں میں سے ایک بات قبول کرنی ہوگی۔ یا وہ یہ تسلیم کریں کہ اسلام کے کل فرقہ جات میں کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ اصولاً وہ سب کے سب ایک ہی مذہب ایک ہی تعلیم ایک

ہی قسم کے عقائد پر قائم ہیں۔ اور جن باتوں نے انہیں اختلاف کی شکل اختیار کرلی ہے۔ انکو اصول اور بنیاد مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ فروعی باتیں ہیں۔ اور اگر کسی اصول سے تعلق رکھتی ہیں۔ تو پھر یہ مفہومًا اختلاف کیفی ہے۔ یہ امر جائز ہے۔ اور ہمیشہ ترقی علمی کا موجب ہوا ہے۔ اور اسی لئے اس اختلاف کا نام بانئ اسلام علیہ الصلوۃ والسلام نے رحمت رکھا ہے۔ کیونکہ اصل مذہب پر یہ کچھ فرق نہیں ڈالتا۔ ان امور پر میرا ایمان ہے۔ اور ان باتوں کو میں نے بالتفصیل قرآن وحدیث کی بنیاد پر بدلائل روشن کتاب مذکورہ بالا میں ثابت کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس معاملہ میں ہم سے متفق نہیں تو پھر یہ امر کفر ماننے کو تیار ہو جائے۔ کہ قرآن آخری کتاب نہیں۔ اور آنحضرت صلعم معاذ اللہ آخری نبی نہیں اب کوئی اور کتاب نازل ہوکر ان اختلافات کو مٹائیگی سورۂ نحل کی جس آیت پر میں بحث کر رہا ہوں۔ یہ اس رکوع کا حصہ ہے۔ جسمیں مختلف اعتراضات متعلقہ الہام قرآن کا جواب نہایت معقول اور خوبصورت طریق پر دیا گیا ہے۔ یہاں تک تو

مختلف ممالک کے اہلکتاب کو جواب دیا گیا ہے۔ کہ کیوں خدا تعالیٰ نے انکی کتب الہامی کی موجودگی میں قرآن کو نازل کرکے انہیں اس کی تعلیم کے قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو فی زمانہ برمھو سماج کی طرف سے ہندوستان میں اور تھی اسٹ چرچ کی طرف سے بلاد غربیہ میں ہوا ہے ان ہی کے ضمن میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں۔ جو خدا کو معبود بنا کر کسی ایک مذہب کے پیرو ہو سکتے ہیں جس کا مقصد اطاعت خدا ہو۔ لیکن اس مذہب کو بشکل الہام و کتاب خدا سے نازل شدہ نہیں مانتے نہ اس بات کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ منشاء ایزدی کو صحیفہ فطرت میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی آجاتے ہیں۔ جو الہام کو تو خدا کی طرف سے مانتے ہیں۔ لیکن الہامی کتب کے الفاظ منجانب اللہ نہیں سمجھتے۔ ان میں قریباً کل دیگر اہل مذاہب آج شامل ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی اپنی کتاب انجیل۔ توریت۔ وید وغیرہ کے مفہوم و مقاصد کا انسانی دلپر القاء ہونا صرف تسلیم

کرتے ہیں لیکن الفاظ کتب مقدسہ کو اب انسان کی تالیف سمجھتے ہیں۔ انگریزی تعلیمیافتہ مسلمانوں میں سے اکثر کا یہی مذہب ہے۔ یعنے وہ وحیٔ متلو کے قائل نہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور مرنجاں برنج کا گروہ ہمارے زمانہ میں پیدا ہو گیا ہے۔ جو کسی خاص مذہب سے وابستہ ہونا آج کے فیشن اور مصلحت کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ تمام کتب مقدسہ کو سامنے رکھ کر ان میں سے حسب ضرورت تعلیمات اخذ کر کے ایک نیا گروہ بنانا چاہتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے۔ کہ یہ خیالات ہیں جو بالکل جدید ہیں۔ اور قرون اولے میں ان کا پتہ نہیں ملتا۔ بلکہ آج چودھویں صدی میں نشوونما پا رہے ہیں۔ ان سب اعتراضات کا جواب قرآن کریم نے مختلف مقامات میں دے دیا ہے۔ لیکن چودھویں سیپارہ کے اس رکوع زیر بحث میں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ آخر الذکر اصحاب کہتے ہیں۔ کہ جس صورت میں نزول قرآن سے پہلے دنیا میں دیگر کتب مقدسہ موجود تھیں۔ گو وہ کسی حالت میں تھیں۔ ان میں سے علماء روزگار حسب ضرورت

ہدایت لے سکتے تھے۔ اور آج بھی یہ ہو سکتا ہے
اسلئے اسبات کی ضرورت نہیں۔ کہ کسی مذہب سے
انسان خود کو وابستہ کرلے۔ اسی اصول پر آج
کل زمانہ مذہبی پارلیمنٹیں اور مجلسیں قائم ہوتی
ہیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں جو زبردست مذہبی کانفرنس
پیرس میں ہوئی۔ اس کا بھی مقصد دراصل
یہی تھا۔ کہ مذاہب مشہورہ کی تعلیمات پر غور کرکے
ایک نیا مذہب تجویز کرلیا جائے۔ بلکہ جرمن کے مشہور
یونیورسٹی گوٹنجن کے پروفیسر ڈاکٹر آٹو نے جو تقریر
پیرس کی اس کانفرنس میں کی۔ اس کا خلاصہ
بھی یہی تھا۔ کہ ہر ایک قوم کا اپنا اپنا مذہب
ہونا چاہیئے جسطرح ہم اپنے ملکی اور مقامی حالات کے
ماتحت کھانے پینے اور پہننے میں اپنے اپنے اوضاع و
اطوار اختیار کرلیتے ہیں۔ اسی طریق پر ہمیں
اپنا مذہب بھی اور قوم سے لینا نہ چاہیئے۔ اگر کسی
مذہب میں کوئی خاص تعلیم اچھی ہو۔ تو اس سے
تمسک کرلینا کسی ہرج کا موجب نہیں۔ پروفیسر
مذکور اور میں ان دنوں ایک ہی ہوٹل میں رہتے تھے
جب جلسہ سے ہم واپس آتے تو کھانے کی میز پر اثنائے

گفتگو میں سے نے انہیں کہا کہ جہاں تک جسم کی پرورش
کا سوال ہے۔ اور جہاں تک قوائے ہضمیہ کا تعلق
ہے۔ کل دنیا جہان کی خوراک ایک ہی ہے۔ خوراک
نے گو مختلف شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ لیکن یہ
اختلاف صرف اس حصہ خوراک میں ہوتا ہے
جہاں تکلّف آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر ایک
خوراک میں خدا کے ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کا جسقدر
حصّہ ہوتا ہے۔ وہ سب جگہ ایک ہی ہیں۔ اشیائے
پوشیدنی میں بھی خدا کی پیدا کی ہوئی چیز سب جگہ
یکساں ہے۔ اختلاف وہیں آتا ہے جہاں انسان
کا ہاتھ ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ الغرض ہر امر
میں وہیں ایکدوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔
جہاں انسانی رائے یا ہاتھ کا دخل ہوتا ہے۔ اب
اگر یہ صحیح بات ہے کہ خدا کی پیدا کردہ چیزیں کل
انسانوں کے لئے ایک ہی ہوتی ہیں۔ انسانی ہاتھ
موجب اختلاف ہوجاتا ہے۔ تو مجھے آپ کی آج
کی تقریر سے اتفاق نہیں۔ مذہب اگر تو کوئی انسانی
چیز ہے تو بیشک ہر قوم کا ایک مذہب الگ ہونا چاہیے
لیکن اگر وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیز ہے۔ تو پھر

کل دنیا کیلئے ایک ہی ہوگی۔ علاوہ ازیں کل انسانوں
کے جسم کی بناوٹ ایک ہی ہے کل قومیں ایک ہی
قسم کا دل و دماغ رکھتی ہے۔ اگر جسمی پرورش کیلئے
ایک ہی قسم کی خوراک ہر جگہ کافی ہوسکتی ہے۔ تو پھر دل و
دماغ یا روح کی تربیت کے لئے کیوں مختلف
تعلیمات کی ضرورت ہے۔ مذہب آخر روح کی تربیت
کیلئے آتا ہے۔ اگر وہ خدا کی طرف سے ہے تو ایک
ہی ہونا چاہئے۔ علاوہ ازیں کل مذاہب کا مقابلہ
کرلو۔ اس سے آپ ایک ہی نتیجہ پر آویں گے۔ یہ جو
آپ لوگوں نے اس وقت ایک نیا علم پیدا کیا ہے
یعنی متقابلہ مطالعہ مذاہب اور اس میں بعض
وقت بعض لوگ اس بات سے حیران
ہوجاتے ہیں۔ کہ مثلاً کیوں چین کے ابتدائی مذہب
میں بعض باتیں وہی ہیں۔ جو مغرب کے کسی انتہائی ملک کے
ابتدائی مذہب میں موجود ہیں۔ یا کیوں عیسائی مذہب کی
بعض تعلیمات بدھ مذہب سے ملتی ہیں۔ بعض
نادان جھٹ ایک مذہب کو دوسرے مذہب کا سرقہ
قرار دیتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہی ہی ہے۔ جو قرآن
نے تعلیم کی۔ کہ ہر ایک قوم کو خدا نے اپنی طرف سے مذہب دیا

ہے۔ پھر مرور ایام سے انسان نے اسمیں آمیزش
کردی۔ جس پر صدیاں گذر گئیں۔ آج ان مذاہب
کا جب مقابلہ کرتے ہیں۔ تو ان کی تعلیمات کا وہ
حصہ جو خدا سے آیا تھا وہ ہر جگہ یکساں ہوتا ہے۔
جہاں انمیں اختلاف ہے۔ وہ انسانی ہاتھ کا کام
ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ خدا کی
طرف سے آیا ہوا ایک ہی مذہب کُل دُنیا کے لئے
ہوجانا چاہئے۔ ایک ہی سورج ایک ہی چاند ایک
ہی زمین ایک ہی پانی ہوا وغیرہ سب کے لئے
یکساں طور پر کام کررہے ہیں۔ پھر مذہب میں
قومی خصوصیات کو کیوں دخل ہو۔ بہرحال اس
قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ ان دلائل کا پروفیسر
مذکور کے پاس کیا جواب ہوسکتا تھا۔ بہرحال
اس گفتگو کے بعد وہ اس مسئلہ کی طرف نہ آئے
اگرچہ ہم اس کے بعد ایک ہفتہ ایک ہی جگہ رہے۔
یہ جو ابھی میں نے منقابلہ مطالعہ مذہب
کا ذکر کیا۔ یہی ان مختلف مذہبی کانفرنسوں کا
اصلی موجب ہے کوشش یہ ہورہی ہے۔ کہ مختلف

مذاہب کے علماء جمع ہو کر مذاہب مختلفہ سے ضروری حصہ تعلیم لیں اور دُنیا کا ایک مشترک مذہب بنا دیں۔ اس بات کی ضرورت اب اسلئے بھی پیدا ہُوئی ہے۔ کہ کُل دُنیا کے لوگ آج ہر جگہ جمع نظر آتے ہیں۔ دُنیا کے کسی بڑے شہر میں جاؤ۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ ایک جگہ میں جمع نظر آتے ہیں۔ اب اگر مذہب نے پیدا ہو کر مختلف افراد کو ہمیشہ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لیا ہے۔ تو آج اس بات کی بھی ضرورت ہے۔ کہ کُل دُنیا کا کوئی مشترک مذہب ہو۔ جو کل افراد عالم کو ایک نقطۂ متحدہ پر جمع کر دے۔ الغرض اس قسم کی باتوں کو سامنے رکھ کر بعض نیک مزاج مذہبی خیال کے آدمی مذکورہ بالا کانفرنسوں کے ذریعہ ایک عالمگیر مذہب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منطق بالکل صحیح اور سچّی ہے لیکن اس پر بعض اعتراض بھی پیدا ہوتے ہیں +

(۱) اگر مذہب ایک امرِ ربّانی ہے۔ جو ہر جگہ اولاً خدا کی طرف سے آیا۔ اور انسانی ساخت نہیں تو پھر جس خدا نے ابتداء سے لے کے گذشتہ زمانوں میں ایک ہی مذہب مختلف انبیاء کے ذریعہ مختلف قوموں کو اسلئے

الگ الگ دیا کر مختلف اقوام و ممالک میں اس وقت میل جول یا آمد و رفت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کل مذاہب مشہورہ کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ مقامی خصوصیات نے بیشک بعض جگہ فروعی اختلافات پیدا کر رکھے ہیں جنہیں اصل مذہب سے بہت کم تعلق ہے۔ اسلئے یہ صاف پایا جاتا ہے۔ کہ مذہب اپنی اصل شکل میں سب کو ایک ہی دیا گیا لیکن آج تو تعلیم عامہ سے جو ایک ہی اصول پر ہر جگہ ہو رہی ہے کل مقامی امتیازات کو قریباً قریباً مٹا دیا ہے۔ گویا کل دنیا اس وقت بمنزلہ ایک ملک کے ہو رہی ہے جہاں ملک بمنزلہ شہر اور شہر بمنزلہ کوچوں کے بن رہے ہیں۔ تو پھر کیوں خود ایسے وقت ایک عالمگیر مذہب نہ بھیج دے جب کل دنیا اس کے علم میں اکٹھے ہونے کو آ جائے یہ کس قدر اُلٹی منطق ہے۔ کہ دنیا کے الگ رہنے تک تو مذہب پیدا کرنے کا کام خدا سے تعلق رکھے لیکن جب دُنیا اکٹھی ہو جائے تو پھر یہ کام انسان کے سپُرد کر دے۔ جو شخص یہ تسلیم کر لے کہ مذہب اولاً خدا کی طرف سے آیا۔ تو پھر اسے یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ تاریخ عالم کے کسی مرحلہ پر بھی مذہب میں دخل انسانی کی

اجازت دے۔ کیا جس ضرورت مذہب عالمگیر کو ان
کانفرنسوں کے بانی محسوس کر رہے ہیں۔ وہ اصل
فرستندہ مذہب یعنی خدا محسوس نہیں کر سکتا۔
اس لئے ہمیشہ ایک ہی انسان کو وقتاً فوقتاً اپنے
مذہب کا ذریعہ یعنے رسول ٹھیرایا ہے۔ تاریخ عالم
میں یہ نظر نہیں آتا۔ کہ اس نے انجمنوں کے ذریعہ
کسی مذہب کی تعلیم کی ہو۔ اب اگر یہ صحیح امر ہے۔ اور
ایک قائل مذہب اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ تو آج
ہمارے زمانہ میں یہ اُلٹی گنگا کیسے بہہ سکتی ہے۔
علاوہ ازیں یہ امر بھی مسلّم ہے۔ کہ اسلام کے
سوا کوئی دوسرا مذہب اپنی اصلی شکل میں نہیں رہا
تو کیا چند لوگ جمع ہو کر مخلوط شدہ تعلیمات مذاہب
میں سے اصلی تعلیم نکال سکتے ہیں۔ یہ امر بالکل
ناممکن ہے۔ جہاں تک ممکن تھا وہ ہو چکا یعنی متقابلہ
مطالعہ مذاہب نے چند اصول اخذ کر لئے ہیں
جو ہر مذہب میں اشتراکاً پائے جاتے ہیں۔ اُن
اصولوں کو بیشک جمع کر کے دیکھ لو وہ بحیثیت مجموعی
مذہب کا کام نہیں دے سکتے۔ اب اگر اُن پر کچھ
ایزاد کیا جائے۔ تو کس مذہب کی تعلیم سے ایزاد کیا جائے

اوّل تو اس امر پر ہی سب کا اتفاق ہونا مشکل ہے اور پھر یہ کون یقین دلا سکتا ہے۔ کہ یہ ازاد کردہ حصّہ خداوندی تعلیم ہے۔ یہ خیالات تو اس صدی میں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن ہر مذہب تو اپنی اصلی شکل آج سے تیرہ چودہ سو برس پہلے کھو چکا تھا۔ کتب الٰہیہ جو قرآن سے پہلے آئیں وہ ورودِ اسلام کے وقت قریباً مفقود ہو چکی تھیں۔ اُن میں تحریف ہو چکی تھی۔ ہر مذہب مجموعہ اختلافات و اضداد ہو چکا تھا۔ پھر اس ڈیڑھ ہزار برس تک اس مذہبی ضرورت کا کیا علاج ہؤا۔ بہرحال خدا کی آخری کتاب نے ان باتوں کو سامنے رکھ کر سب کا جواب دیدیا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن خدا کا آخری کلام کہلانے کا مستحق نہ ٹھیرتا۔ اسی سورۂ نحل میں جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے ہم ذیل کی آیات پاتے ہیں۔ واللّٰہ انزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض بعد موتھا ان فی ذالک لاٰیۃ لقوم یسمعون۔ اللہ تعالیٰ ہی آسمان سے پانی اُتارا کرتا ہے (جب زمین مرجاتی ہے) پھر اس سے زمین کو زندہ کر دیتا ہے

سُننے والے اسی امر پر غور کر لیں۔ قرآن نے تیرہ سو برس ہُوئے۔ جب دُنیا کو اس امر سے اطلاع دی۔ کہ جوہر حیات پانی ہے + یعنے پانی ہی مولد حیات ہے۔ اور آج سائنس نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ آسمان سے اُترا ہُوا پانی اپنے ساتھ جوہر حیات لاتا ہے۔ لاکھ زمین پر پانی موجود ہو۔ آخر سمندر۔ دریا۔ جھیلیں۔ پانی سے بھری موجود ہیں۔ ان میں کسی میں وہ رُوح زندگی نہیں جو آسمان سے اُترا ہوُا پانی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جس سال امساک بارش ہو۔ اس سال نہ صرف اچھی فصلیں ہی نہیں ہوتیں۔ بلکہ مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دریاؤں میں خود مچھلیاں مرکر پانی کی تہ پر آجاتی ہیں۔ جس حد تک نہروں میں جوہر حیات باقی رہجاتا ہے وہ ممد فصلات تو ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک تو غیر مکتفی ہوتا ہے۔ دوسرا وہ پورے طور پر کام نہیں کرتا۔ اب پانی تو دنیا میں کثرت سے موجود ہے۔ لیکن اسمیں ارضی مواد مل گئے ہیں۔ اسلئے اسکے جوہر حیات میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ٹھیک

یہ ہی حالت الہام الٰہی کی ہو جاتی ہے۔ آسمان
سے یہ خدا کا پانی آتا ہے۔ اور اپنے ساتھ حیات کی رُوح
لاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسمیں بھی مواد ارضیہ یعنی
انسانی خیالات کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اب کیا
آج تک انسان اس قابل ہؤا ہے۔ کہ کسی مشین
کے ذریعہ اُن نہروں جھیلوں اور سمندروں کے
پانی میں سے موادِ ارضیہ الگ کرکے پانی کو اپنی
اصلی شکل میں لے آئے اور قابل زراعت بنادے
یہ جو آئے دن امساک بارش کے باعث دُنیا میں
طرح طرح کی مصیبتیں پیدا ہو جاتی ہیں کیوں ان
کا خاتمہ نہیں کر دیا جاتا ۔ کسی سمندر کے کنارہ
پر کسی مشین کو کھڑا کر دیا جائے جس کے ذریعہ پانی
کو اسکی آسمانی شکل میں لا کر ملک کے ملک کو اس سے
سیراب کر دیا جائے۔ اب اگر یہ امر ناممکن ہے۔ اور
اسکی طبعی طرز یہی ہے۔ کہ خدا کا بنایا ہؤا سورج
ہی سمندروں کے مُردہ پانی کو آسمان پر بیجا کر
خدائی ہاتھوں سے اُسے پاک صاف کر دے۔ اور

*- جہازوں میں بعض وقت ایک آلہ جسے کنڈنسر کہتے ہیں سمندر کے پانی کو پینے کے قابل بنانے کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن وہ صرف ذائقہ بدلتا ہے اُسے شیریں پانی سے کوئی نسبت نہیں آتی +

پھر آسمان سے واپس لاکر اُسے دُنیا کی زندگی کا موجب کردے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا کا رُوحانی پانی جو توریت۔ انجیل۔ زبور۔ ژندواوستا۔ وید تعلیمات بُدھ وغیرہ وغیرہ کی شکل میں اپنے اپنے وقت پر آسمان سے نازل ہوا۔ جب ایک مُدت کے بعد انسانی دستبردسے اسمیں مواد ارضیہ ملا دیئے وہ کیوں واپس آسمان پر جاکر خدا کے ہاتھ سے پاک صاف نہ ہو۔ اور پھر از سرنو قرآن کی شکل میں نازل نہ ہو۔ اگر انسانی دماغ پانی جیسی جسمانی چیز کو پاک صاف کرکے اسے آسمانی شکل میں نہیں لاسکتا تو پھر رُوحانی پانی یعنی الہام کو یہ انسانی کانفرنسیں اسکی آسمانی شکل میں کب لاسکتی ہیں۔ قرآن نے الفاظ بالا میں گویا اس امرمحال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مردہ زمین کو امساک باراں کے بعد اگر زندہ کرتے ہیں۔ تو ہم ہی کرتے ہیں۔ اب نزول قرآن کے وقت صدیوں سے الہام خداوندی کہیں نازل نہیں ہوا تھا پچھلا پانی یعنے قدیمی کتب مقدسہ اس وقت مخلوط اور ناقابل استعمال ہوگئی ہیں۔ اسلئے اب تازہ شیریں پانی آسمان سے نئی

کتاب کی شکل میں اُترا ہے۔

بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنی ہدایت کیلئے خود تعلیمات دُنیا میں سے کچھ اِنتخاب کر سکتے ہیں۔ قرآن نے مذکورہ بالا آیت کے بعد ہی دوسری آیت میں اس غلطی کا بھی ازالہ کیا ہے۔ وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم من بطونھا من بین فرث ودماً لبناً خالصاً سائغاً للشاربین۔" پھر تمہارے لئے یہ مویشی قابل غور ہیں۔ ان کے پیٹ کے اندر گوبر اور خون میں سے رچتا پچتا دُودھ ہم تمہیں نکال کر پلاتے ہیں۔" بات یہ ہے۔ کہ یہ دُودھ مویشی کی غذا میں موجود ہوتا ہے۔ مثلاً گھاس۔ دانہ۔ بنولے وغیرہ ان میں تین چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ خون دُودھ اور گیس اب کیا ضرورت ہے کہ دنیا میں مویشی ہوں۔ کیوں نہ ان چیزوں کو لے کر کسی مشین میں ڈال دیا جائے۔ اور ان میں سے دُودھ نکال لیا جائے۔ دُودھ تو مویشیوں میں موجود نہیں ہوتا۔ یہ تو ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جنہیں مویشی اپنی خوراک بناتے ہیں۔ مویشی دراصل دودھ نکالنے کی کلیں

ہیں۔ اب اگر جسمی پرورش کیلئے دُودھ جیسی ضروری چیز کو انسان مواد موجودہ میں سے نہیں نکال سکتا۔ تو روحانی دُودھ کو یہ کس طرح مواد مخلوطہ میں سے نکال سکتا ہے۔ رُوحانی اصطلاح میں دُودھ کو روحانی علم سے تعبیر کیا کرتے ہیں+

جسم کی پرورش کے لئے جیسے کہ اُوپر بیان کیا ہے ذیل کی چیزیں ضروری ہیں۔ مائعات یعنی پانی وغیرہ۔ دہنیت۔ شکر۔ نشاستہ۔ فاسفورس۔ حموضات یعنے نمک وغیرہ۔ پروٹین۔ ان میں سے پہلی دو چیزیں۔ دُودھ میں آگئی ہیں۔ جن میں کچھ نشاستہ اور شکر بھی ہوتی ہے۔ لیکن دُودھ دنیا میں اس قدر نہیں ہے کہ کل دُنیا کی پرورش کرسکے۔ انسان کو مائعات کا حصہ پانی سے ہی لینا ہے۔ اور باقی کُل کی کُل چیزیں اُسے نباتاتی دنیا بہم پہنچاتی ہے۔ اناج۔ پھل۔ پھول یقولات ان چیزوں میں سے انسانی جسم اپنی پرورش کیلئے مذکورہ بالا اجزاء لیتا ہے۔ اب ان جن چیزوں سے نباتات درخت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا مواد ہمارے ارد گرد موجود ہے۔ آکسیجن۔ ہائڈروجن۔

کاربن - نائٹروجن - فاسفورس - سوڈیم - یہ سب
کی سب چیزیں کچھ کرۂ ہوائی میں اُڑتی پھرتی ہیں
کچھ زمین کے اندر موجود ہیں - مثلاً گُل کی کُل معدنیات
نمک تیزاب - یہ سب کی سب چیزیں جو ہوا پانی اور
خاک میں موجود ہیں - سُورج کی حدت اور روشنی
سے کہیں مُنفرد اور کہیں مرکّب ہو کر بیل اور بوٹوں کی
مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں - پھر یہ بیل
پھُول تمام کے تمام ارضی مواد کا رُوح زمین سے کشید
کر کے اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں - مثلاً تمام پھلوں میں
ایک حصّہ لوہے کا موجود ہوتا ہے - اسی طرح سبزیوں
میں شلغم اور پالک میں بھی زیادہ حصّہ فولاد کا ہوتا ہے
یہ سب کی سب چیزیں منفرداً اور مشترکاً ہمارے جسم
کی پرورش کے لئے ضروری ہیں - قرآن نے کسی اور
مقام پر ان کا نام سلالۃ من طین یعنے کشید از زمین
رکھا ہے - یہ گویا گُل کے کُل پھل پھُول - نباتات
اجناس - جوہر ارضیہ کو زمین سے کھینچ کر اشیائے
خُوردنی و نوشیدنی بن جاتی ہیں - علاوہ ازیں ایک
فصل کے بعد کل اجناس میوہ جات وغیرہ کے
عناصر و ذرات بھی ہوا میں موجود رہتے ہیں - کیوں

انسانی عقل نے آج تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کی۔ کہ جس سے ہم ان عناصر کو جمع کر کے کُل دُنیا کیلئے خوراک بہم پہنچالیں۔ خود ہی پھل پھول پیدا کر لیں۔ خود ہی پینے کی چیزیں پیدا کر لیں لیکن انسان یہ نہیں کر سکتا۔ یہ سب درخت اور افراد عالم نباتات خدا کی مشینیں ہیں جو اپنی اپنی طرز پر ان تمام عناصر کو ہمارے لئے کھانے کی چیزیں جمع کر دیتی ہیں۔ اور زمین میں کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتیں۔ ہمارے دوست مولوی عبدالحنان خان پشاوری جو کھجورہ کے پانی کے بہت شائق ہیں۔ وہ کھجورہ اور تاڑ کے درخت کو پانی بھیک کھا کرتے ہیں۔ اور اس بھیک میں بچی ہوئی شراب کو کل دنیا جہان کی شرابوں پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ کہ اگر انسان مخلوط عناصر میں سے حسب مطلب مواد الگ کر کے اسے کسی مناسب ترکیب میں لانے سے اپنے کھانے پینے کی چیزیں نہیں نکال سکتا۔ تو پھر روحانی خوراک کے لئے ان مخلوط عناصر رُوحانیہ میں سے جن سے مُراد توریت۔ انجیل وغیرہ یا دیگر اخلاقی کتابیں

ہو سکتی ہیں۔ کس طرح روحانی اکل و شرب کی چیزیں
نکال سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے جسم کی
پرورش در اصل کن چیزوں سے ہوتی ہے۔
دہنیت نشاستہ۔ پروٹین وغیرہ۔ اس سے بھی
آگے چلیں تو کچھ کاربن۔ نائٹروجن۔ آکسیجن۔
فاسفورس۔ سوڈیم وغیرہ ہے۔ یہ منفرد شکل میں
دستیاب ہو سکتی ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے
کہ ہم خدا کے محتاج ہوں۔ خصوصاً جسم کی
پرورش نائٹروجن سے ہوتی ہے۔ اسہی سے
نشاستہ تیار ہوتا ہے۔ کیا ضرورت ہے۔ کہ ہم
خدا تعالیٰ کے محتاج ہوں۔ کیوں نہ نائٹروجن خود
پیدا کرکے جسم میں بھیجدیا کریں۔ ایسا ہی اور عناصر
بھی۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ان عناصر کے
ہونے پر بھی خدا کی طرف دیکھنا ہے۔ وہ ترکیب
در ترکیب دیگر اجناس پھل پھول وغیرہ ہمارے لئے
تیار کرے۔ جب یہ جسم کی پرورش کا حال ہے۔ تو
پھر روح کی پرورش کے لئے گو بعض تعلیمات منفرداً۔
عناصر کی شکل میں ہر جگہ موجود ہوں لیکن یہ ترکیب
اور شکل تو خدا کے ہاتھ سے پاوینگے تو پھر مفید ہونگے

کیا عجیب بات ہے کہ دُودھ کی دلیل و بکر مذکورہ بالا آیت کے بعد ہی دلیل اس کی الفاظ ذیل میں قرآن نے دی ہے۔ ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منه سکرًا ورزقًا حسنا۔ ان فی ذالك لاٰیة لقوم یعقلون ۔ عقلمند لوگوں کے لئے یہ بھی ایک دلیل ہے۔ کہ وہ انگور اور کھجور جیسے پھلوں میں کھانے پینے کی اچھّی چیزیں اپنی پرورش کیلئے نکال لیتے ہیں۔ اگر غور کرو تو تمہارے خیالات کا ان ہی میں جواب ہے ۔

اب ان تین مسلسل آیات میں قرآن نے پانی دُودھ اور ثمرات کا ذکر کر کے اور ان کے طریق پیدائش کی طرف اشارہ کر کے معترضین الہام قرآن کے سامنے یہ باتیں بطور دلیل پیش کیں۔ اور یہ اشارہ کیا۔ کہ یہ سب کی سب چیزیں جس مواد سے ہم پیدا کرتے ہیں۔ وہ نیچر میں موجود ہوتا ہے۔ اس پر تمہیں بھی دسترس ہے۔ لیکن جس طرح تمہارا ہاتھ انہیں ترکیب دے کر پرورش جسم کی اشیاء نہیں پیدا کر سکتا۔ اسیطرح رُوحانی تعلیم کا معاملہ ہے۔ جس کو پرورش رُوح

سے تعلق ہے - دونوں قسم کی پرورش کے لئے
جو بھی چیز ضروری ہے اُسکی پیدائش کو خدا کے
ہاتھ سے ہی تعلق ہے - ان آیات کے بعد خدا
کی کتاب نے ایک اور منظر قدرت کی طرف اشارہ
کردیا ہے - اس بات کا بھی جواب دیدیا ہے کہ
مختلف کتب و تعلیمات میں سے مفید انسان
چیز کا نکالنا یا بالفاظ دیگر ان تمام کتب میں
سے رُوح کو کھینچ کر ایک مفید مرکب چیز بنا لینا
بھی تمہارے ہاتھ کا کام نہیں - یہ بھی خدا ہی کیا کرتا
ہے - واوحی ربک الی النحل ان اتخذی
من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون
ثم کلی من کل الثمرات فاسلکی سبل ربک
ذللا - یخرج من بطونها شراب مختلف
الوانها فیہ شفاء للناس ان فی ذٰلک لاٰیۃ
لقوم یتفکرون ہ تیرے ربّ نے شہد کی مکھی کو
وحی کیا کہ وہ پہاڑوں اور اونچے درختوں پر
اپنا چھتہ بنائے - پھر وہ کُل پھلوں کو کھائے
اور نہایت انقیاد کے ساتھ خدا کے راستوں
پر چلے - پھر اُس کے پیٹ میں سے مختلف رنگوں

پی پینے کی چیز نکلتی ہے جسمیں انسان کے لئے شفاء ہے۔ غور و فکر کرنیوالوں کے لئے اِسمیں نشانیاں ہیں۔ ان آیات کی تشریح کرنے سے پہلے دو تین باتوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ خدا تعالےٰ نے مختلف پھلوں میں مختلف امراض کا علاج رکھا ہے۔ ان پھلوں کی رُوح کی کشید سے مختلف شربت بنائے جاتے ہیں لیکن کوئی بھی ایسا شربت اِنسان نہیں بنا سکا کہ جس کا قوام کچھ عرصہ کے بعد بگڑ نہ جائے۔ بالمقابل شہد ایک ایسا شربت ہے کہ ایک طرف اسمیں صدہا امراض کا علاج ہے کیونکہ اسمیں گُل پھلوں اور پھولوں کی کشید ہے۔ دوسری طرف اگر اسے کسی اور چیز سے مخلوط نہ کیا جائے۔ تو اس کا قوام کبھی نہیں بگڑتا۔ بلکہ اسمیں محفوظ طریق پر جو پھل بھی ڈالا جائے وہ بھی نہیں بگڑتا۔ جس طرح مختلف پھل مختلف امراض کا علاج ہیں اسی طرح خدا کے مختلف الہام بھی رُوحانی پھل بن کر رُوحانی امراض کا علاج کرتے ہیں۔ پھلوں کی عدم موجودگی میں انسان نے ان کے رب اور شربت تیار کئے۔

پھر مختلف پھلوں کو اکٹھا کشید کر کے بھی اسی قسم کے رُبّ اور شربت تیار کئے۔ ایک طرف یہ شربت اور رُبّ نہ تو پھلوں کا پورا قائمقام ہوتے ہیں نہ دیر تک اُن کا قوام قائم رہ سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان نے اصلی الہامی کتابوں کے گم ہو جانے پر ان کے ترجمے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ لیکن وہ ترجمے بھی مسلمۃً ہمیشہ مفید ثابت نہیں ہوئے۔ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قابل ترمیم ہو گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ قریباً قریباً ہر ایک زبان کے الفاظ اپنے تشکل و معانی میں بدلجاتے ہیں۔ اسلئے وہی زبان دو تین نسل کے بعد قابلِ فہم نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ ترجمے قابل ترمیم ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اسی نظارہ عالم کو سامنے رکھکر یہ ثابت کرنا چاہا ہے۔ کہ جس طرح اصلی پھلوں کے موجود نہ ہونے پر تمہیں رُبّ اور شربتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن تمہارے رب اور شربت استعمال کے قابل نہیں رہتے۔ انسان کے مقابل ہم بھی ایک شربت نکالتے ہیں جسمیں کُل دنیا جہان کے پھلوں کی روح کھینچ دیتے ہیں۔ پھر اس کا قوام بھی کبھی نہیں بگڑتا۔ یہی حالت قرآن کی ہے۔ اس میں

تمام گذشتہ کتابوں کی تعلیم کی کشید رکھ دی گئی ہے پھر اسے ایسی زبان میں رکھ دیا گیا ہے۔ کہ وہ آئندہ کے بگڑنے سے محفوظ ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ امر بدیہی ہے۔ قرآن شریف کے علاوہ کوئی مقدس کتاب محرّف اور مبدّل ہونے سے نہیں بچی۔ اب جس طرح شہد جیسی چیز جو گل پھلوں کا قائمقام ہے۔ انسانی ہاتھ پیدا نہیں کر سکتا۔ اسیطرح سابقہ ربّانی تعلیمات کو بھی انسان ایک مفید ترکیب میں جمع نہیں کر سکتا۔ ان آیات کو بحیثیت مجموعی غور کرو۔ پھر دیکھو کس طرح ایک رکوع میں خدا تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے ان تمام اعتراضات کا جواب دیدیا ہے۔ جو آج اسوقت دلوں میں اُٹھ رہے ہیں۔ ان ہی آیات میں ذیل کے اعتراضات کا بھی جواب آجاتا ہے۔

(۱) قرآن کے الفاظ بشکل زبان عربی تو پہلے ہی موجود تھے۔ پھر قرآن کے الفاظ کو کیوں خدا کے الفاظ کہا جاتا ہے (۲) قرآن کریم یا خدا کا آخری الہام کیوں عربی زبان میں نازل ہوا +

پہلا اعتراض تو کائنات کے نظائر بالا ہی

عمل کر دیتے ہیں۔ جن عناصر و ذرات سے کہ کل درخت ترکیب پاکر اپنی اپنی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ سب درختوں کی پیدائش سے پہلے ہی منفرد حالت میں موجود ہوتے ہیں۔ درختوں کی شکل میں اُن کے ترکیب پا لینے کو ہم خدا کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے قرآن کی تنزیل سے پہلے اس کے الفاظ کا منفرداً عربی زبان میں موجود ہونا اس امر کی کوئی دلیل نہیں۔ کہ ان ہی الفاظ سے ترکیب یافتہ فقروں۔ جملوں یا آیات کو ہم خدا کی طرف منسوب نہ کر سکیں۔ جو پانی آسمان سے بذریعہ بارش آیا کرتا ہے۔ وہ بھی آخر زمین سے ہی جاتا ہے۔ اور نزول بارش سے پہلے ہی زمین پر موجود ہوتا ہے۔ پھر اگر زمین سے آسمان پر جاکر پانی کا پاک صاف شکل میں واپس آنا یعنے نزول بارش ایک فعل خداوندی ہو سکتا ہے تو پھر یہ ماننے میں کونسی مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ زمین سے ہی اوپر جاکر الفاظ ربانی ترکیب میں واپس آجائیں۔ ہاں اس نظریہ پر صرف ایک اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ درختوں کے

ذرّات اور زمین سے اوپر جانے والا پانی بھی اولاً خدا کے ہاتھ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ اور جس زبان میں الہام ہوتا ہے وہ انسانی ہوتی ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح مان بھی لیا جائے۔ تو اسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے۔ جب انسان کی سب سے پہلی زبان بھی انسان کی بنائی ہوئی قرار دی جائے۔ لیکن یہ امر ماننے کے لئے ہم تیار نہیں ہم انسان کی زبان اولین کو انسانی ساخت نہیں مانتے بلکہ اُسے الہامی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انسان کا کل کا کل علم خارج سے آتا ہے۔ اور وہ اس کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے چنانچہ پیدائش کے وقت انسان کسی علم کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے اعضا میں اعضائے حسیہ کا وجود ہی بتلاتا ہے۔ کہ اس نے جو کچھ بصورت علم حاصل کرنا ہے۔ وہ اندر سے نہیں باہر سے حاصل کرنا ہے۔ اگر انسانی علم اسکی جائداد اندرونہ ہوتی تو حواس خمسہ اسکے ذریعہ علم نہ ہوتے۔ انہیں سے کسی حس کا ضائع ہوتا انسان کو اس حصہ علم سے محروم کردیتا ہے جو اس حس سے وابستہ ہے۔ ان حواس کے ذریعہ جو امر

انسان معلوم کرتا ہے۔ اگر وہ دلپسند ہو اتو آئندہ کے لئے اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اور جو بات ناپسند ہو اُسے دل قبول نہیں کرتا نہ وہ حافظہ میں محفوظ رہتی ہے۔ چنانچہ حافظہ میں باہر سے لیکر خزانہ کردہ چند صد اقتوں کے ماتحت جو قوت پسندیدگی امر خیر و ناپسندیدگی امر شر ہم میں پیدا ہو جاتی ہے اسی کا نام کانشنس ہے۔ سو کسی کا کانشنس ضروری نہیں کہ ہمیشہ صحیح راہ کا ہادی ہو سکے یہ تو ان حالات کا نتیجہ ہے جنمیں کوئی انسان تربیت پاتا ہے۔ قرآن کریم نے حواس خمسہ میں سے آنکھ اور کان کو لے کر اس حقیقت کیطرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ بینائی اور شنوائی ہی علم کے دو بڑے ذریعہ ہیں۔ واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدہ لعلکم تشکرون جب تم ماں کے پیٹ سے آتے ہو تمہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہمنے ہی تمہیں آنکھ کان (دیکھنے سُننے کے لئے) اور دل (محاکمہ کرنے کیلئے) دیا ہے تاکہ تم شکر گذار رہو۔ پھر خود ہر ایک بات زبان کان کے ذریعہ

ہی سیکھی جاتی ہے۔ جو مادرزاد بہرے ہوتے ہیں وہ اسی لئے پیدائشی گونگے ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے کوئی الفاظ ہی نہیں سُنے۔ جن کی وہ نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ الغرض یہ امر تو مُسلّم ہے کہ الفاظ انسانی جس کے مجموعہ کا نام زبان ہے اندر سے نہیں نکلے بلکہ باہر سے آئے۔ رہا یہ کہ انسان نے کسی خدائی آواز کو سُنا جیسے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں۔ یا اس نے کتے بلیوں کی آوازیں سن کر نقلیں کرنا شروع کردیں جیسا کہ یورپ کے فلسفی کہتے ہیں۔ جو ہمیشہ آسمان کی طرف نہیں۔ بلکہ زمین کی طرف طبعاً میلان رکھتے ہیں۔ یہ ایک امر متنازعہ ہے ہم نے اپنی کتاب ام الالسنہ میں یہ ساری باتیں بحث میں لاکر یہ بات ثابت کی ہے۔ کہ انسان کی پہلی زبان عربی مبین تھی۔ اور وہ خدا کی تعلیم کردہ ہے۔ وعلمہ البیان +

دوسرا سوال کسی قدر بحث طلب ہے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کے علم میں جب کل دُنیا اکٹھی ہونے کو آئے تو آئے کل انسانوں کو مذہباً بھی ایک جگہ قائم کرنے کے لئے

اس ملک کو چن لیا جو اس وقت کی معلومہ دنیا
میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس بات کو
انہوں نے آیت ذیل سے استنباط کیا۔ و
کذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء
علی الناس "تم ایک درمیانی قوم ہو جو دنیا جہان کے
لوگوں کے لئے اٹھائے گئے ہو"۔ نزول قرآن کے وقت
تو یہ معنے صحیح ہو سکتے تھے۔ لیکن آج انسان کے
سامنے کل دنیا ہے۔ جس کی گولائی کسی مقام کو مرکزی
حیثیت نہیں دیتی۔ دوسرے خود وسط کے معنی
عربی زبان میں اچھے یا بہتر بن کے موجود ہیں
چنانچہ قرآن نے دوسری جگہ لفظ وسط کی جگہ
لفظ خیر استعمال کیا ہے۔ جیسے فرمایا۔ کنتم
خیر امۃ +

آخری کتاب کو عربی زبان میں بھیجنے کی وجہ
قرآن کریم نے الفاظ ذیل میں فرمائی ہے۔
انا انزلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون +
ہم نے قرآن کو عربی میں اسلئے نازل کیا ہے کہ
تم سمجھ میں آتا ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ عربی زبان کے سوا باقی
کل ملکی کل دنیا میں معرض تغیر و تبدل میں رہیں

آج کسی زبان کو لیکر اُس زبان کی آج سے تین چارسو برس پہلے کی کوئی تصنیف شدہ کتاب دیکھ لیجائے۔ وہ عام فہم نہ ہوگی۔ اس وقت کی اگر کوئی فرہنگ ملجائے تو شاید وہ زبان قابل فہم ہو۔ مثلاً انگریزی زبان میں چوسر کی تصنیف بلکہ اسکے کئی سو برس بعد اسپنسر کی کتاب فیری کوئین ناقابل فہم ہے۔ خود فارسی زبان کی ایک ابتدائی شکل یعنے پہلوی کو تو کوئی سمجھتا ہی نہیں چنانچہ آتش پرستوں کی مذہبی کتاب دساتیر کو سمجھنے والے بہت کم نکلیں گے۔ ہمایوں کے وقت کا ایک دیوان پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے اُس کا آج سمجھنا ایک امر مشکل ہے۔ خود ہندوستان کی مختلف زبانوں کو دیکھ لیا جائے۔ ان میں کی شمالی ہند کی زبانیں سب کی سب سنسکرت سے نکلی ہیں لیکن ایک زبان بولنے والا دوسری زبان سیکھنے کے بغیر نہیں سمجھ سکتا۔ آج سے ہزار برس پہلے بھی وید مقدس کی زبان ہندوستان میں بولی نہ جاتی تھی۔ حالانکہ اس وقت تو بیرونی عناصر جن سے زبان میں تبدیلی واقع ہوا کرتی ہے

ہندوستان میں بہت کم تھے۔ الغرض ہر ایک زبان
کی الفاظ کہیں اپنی شکل میں اور کہیں اپنے معنوں
میں رات دن بدلتے رہتے ہیں۔ جس کا لازمی
نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ پانچ چھ سو برس کے بعد
کوئی کتاب کسی زبان میں عام فہم نہیں رہتی۔ اس
قاعدہ عامہ میں امتیاز استثناء صرف حجازی
اور یمنی زبان عربی کو حاصل ہے۔ عرب کی اس
استثنائی حالت کی وجوہ پر بحث کرنا۔ اس کتاب
کے موضوع سے دور ہے۔ صرف اسی قدر لکھنا
کافی ہے۔ کہ اس استثناء کو دنیا کے ماہرین علم اللسان
نے تسلیم کر لیا ہے۔ لہٰذا یہ امر مسلم ہے کہ جس زبان
میں کوئی الہام نازل ہو وہ پانچ چھ سو برس کے بعد
قابل فہم نہیں رہیگا۔ لوگ اس کے ترجمہ کرنے پر
مجبور ہو جائیں گے۔ جس سے اصل کتاب آہستہ
آہستہ حافظہ اور مطالعہ سے نکل کر طاق نسیان
پر جا بیٹھے گی۔ اور وہاں سے ممکن ہے ہمیشہ
کیلئے گم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ الہامی کتابیں
آج اپنی اصلی شکلوں میں مفقود ہیں۔ آج سے
بارہ سو برس پہلے مختلف اقوام انسانی طبعی اور

اور مصنوعی موانعات کے باعث ایکدوسرے سے کوئی تعلّق نہ رکھتی تھیں - باہمی میل جول یا آمدورفت کے آسان ذرائع اس وقت موجود نہ تھے - بلکہ بعض قوموں کو تو بعض قوموں کی ہستی کا علم نہ تھا - یہ حالت تجربہ ہی قومی تعصّبات و تفاخر کا باعث تھی جس پر آرین لٹریچر آج شاہد ہے - جس طرح آج انگریزی یا عربی ایک وسیع حصہ دُنیا کی زبانیں ہیں - آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار برس پہلے کسی زبان کو یہ امتیاز حاصل نہ تھا - ایسے وقت ضروری تھا - کہ ہر قوم کو اسکی اپنی زبان میں الہام دیا جائے - چنانچہ ایسا ہی ہُوا - لیکن جب دنیا اکٹھے ہونے پر آگئی اور ایک مذہب عالمگیر کی ضرورت پیدا ہوچکی اُس وقت اگر خدا تعالیٰ پرُانی محرف شدہ کتابوں کی قائمقام ایک آخری کتاب کُل قوموں کو دینا چاہے اور سہات کو بھی مدّ نظر رکھے - کہ وہ کتاب ایسی زبان میں ہو جو تغیّرات آیندہ سے محفوظ رہکر ہمیشہ کیلئے قابل فہم رہے - تو پھر ان اوراق کے پڑھنے والے خواہ وہ کسی مذہب اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں خود فیصلہ کریں - کہ عربی زبان کے سوا اس مقصد کو کون

زبان پورا کر سکتی ہے - بالغرض قرآن کریم یا خدا کی
کوئی عالمگیر کتاب کسی اور جگہ یا کسی اور زبان میں
نازل ہوتی - تو کیا وہ آج عام فہم ہوتی - عربی کے سوا
ہمیں کوئی زبان روئے زمین پر نظر نہیں آتی جو
آج سے تیرہ سو برس پہلے زمین کے کسی حصہ میں
بولی جاتی تھی اور آج اسی شکل میں قائم ہو - اگر یہ نہیں
تو پھر عربی زبان کے سوا کس کو حق پہنچ سکتا ہے -
کہ وہ زبان خدا کے آخری کلام کی تختگاہ بن سکے
اسلئے الہام الٰہی کا یہ کہنا کہ قرآن کو خدا نے عربی
زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمیشہ عام فہم رہے -
کس قدر سچی بات ہے - اسی فقرہ میں لفظ عربی
کو نکالکر لفظ سنسکرت - فارسی - ایرانی ڈال کر
دیکھ لو تو یہ فقرہ آج سے تیرہ سو برس پہلے کا بولا
ہوا اگر ہوتا تو آج جھوٹا ہوتا ؛

اس موقعہ پر شاید کوئی یہ اعتراض کرے کہ
آج پریسوں سے نکلنے اور کتب لغات کے بن جانے
نے اس ضرورت کو رفع کر دیا ہے - اسلئے عربی زبان
کی یہ خصوصیت آج قائم نہیں رہتی - لہٰذا اگر
خدائی الفاظ ہمیشہ صداقت سے خالی نہیں ہونے

چاہئیں۔ اور اگر وہ وقتی نہ ہوں تو ان کے معانی ہمیشہ صحیح ثابت ہونے چاہئیں۔ تو فی زماننا ان واقعات کو روشنی میں قرآن کریم کا یہ کہنا غلط ہو جاتا ہے۔ یعنے انا انزلناہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون۔ قرآن کو عربی میں اسلئے نازل کیا۔ کہ تم اُسے سمجھتے رہو۔ اس اعتراض کی ظاہرا معقولیت ہمیں جس جواب پر مجبور کرتی ہے۔ وہ ہمیں عربی زبان کی ایک اور لسانی خوبی کی طرف لے جاتی ہے۔ جس کی تشریح تو ایک کتاب چاہتی ہے۔ لیکن اجمالاً میں اس کا ذکر یہاں کر دیتا ہوں +

ہر ایک زبان میں جہاں الفاظ کے معانی اعتباری ہوتے ہیں۔ وہاں عربی زبان میں الفاظ کے معانی مفہوم کی حقیقت کی طرف ہمیں لیجاتے ہیں۔ یعنے عربی کے سوا کل دیگر زبانوں کے الفاظ جن معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ معنے اُن کے اندر موجود نہیں ہوتے۔ بلکہ انسان نے ایک آواز کے ایک معنے مقرر کر دیئے ہیں۔ لیکن کیوں کوئی خاص آواز کسی مقررہ معنے کیلئے انتخاب

کی گئی ہے - اس کے لئے کوئی وجہ موجبہ کسی زبان میں تلاش کرنا ایک بے سود امر ہے - لیکن عربی زبان میں یہ خوبی ہے - کہ اس کے الفاظ اپنی حقیقت کے خود شاہد ہوتے ہیں - مثلاً ہم ایک لفظ گناہ جو فارسی کا لفظ ہے - اور اس کے مترادف کو دیکھیں انگریزی میں گناہ کا مترادف سن اور سنسکرت میں "پاپ" ہے - اب یہ تینوں - انگریزی - فارسی - ہندی الفاظ اپنے لفظی معانی کے لحاظ سے حقیقت گناہ ہم پر آشکار انہیں کرتے ہمیں ان زبان کے بولنے والوں سے پوچھنا پڑیگا - کہ گناہ کیا چیز ہوتا ہے پھر اس حقیقت گناہ سے آشنا ہوکر ہم کسی چیز کو امر گناہ یا امر معلوم کر سکیں گے - ممکن ہے جس امر کو آج گناہ سمجھا جائے - وہ کسی قوم کے نزدیک کل گناہ نہ رہے - اس لئے یہ الفاظ اعتباری طریق سے نہ کہ معنوی طریق پر ہمیں گناہ کی حقیقت سے آشنا کر سکتے ہیں - بالمقابل عربی زبان میں جس قدر بھی الفاظ گناہ کے لئے آئے ہیں - ان سب میں ایک حقیقت دائر وسائر ہے - اور وہ یہ ہے کہ مقام اعتدال یا مقام مناسب سے یا مقررہ حدود سے آگے

پیچھے ادھر اُدھر ہو جانے کا نام گُناہ ہے۔ مثلاً عدوان۔ حد سے گزرنا۔ ذنب۔ مناسب حد سے بڑھ جانا۔ عصیٰ۔ تجاوز کرنا۔ جرُم مقام اصلی سے گھٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔ اس امر کو لفظ توبہ نے اور آشکارا کر دیا ہے۔ توبہ کے لفظی معنے واپس آنے کے ہیں۔ یعنی اگر مقام الف پر قائم رہنا نیکی ہے تو مقام الف سے جُدا ہونا (جرُم) پرے ہو جانا (ذنب) اس کے حدُود سے تجاوز کرنا (عدوان) اگر گناہ ہے تو پھر مقام الف کی طرف واپس آنا ہی حقیقی توبہ ہے۔ خدا کو تواب اسلئے کہتے ہیں۔ کہ ہمارے گناہ کرنے پر اگر وہ ہم سے الگ ہو جاتا ہے۔ تو ہماری توبہ (واپس آنے) پر وہ بھی ہماری طرف واپس آجاتا ہے اسی طرح وہ تمام حقائق اور صداقتیں جنکی تعلیم کوئی مذہب کرتا ہے۔ وہ ساری کی ساری اُن لفظوں کے معنوں میں موجُود ہیں۔ جو عربی زبان نے ان کی مفہوم کی ادائیگی کے لئے وضع کئے ہیں۔ مثلاً جنت۔ خیر۔ شر۔ فلاح۔ الہام۔ وحی ایمان۔ عمل۔ عذاب۔ الغرض یہ جس قدر بھی الفاظ

ہیں۔ ان کے مفہوم کیلئے جہاں دوسری زبانوں میں ہمیں مذاہب مختلفہ کے متکلمین کے پاس بغرض تشریح و تفہیم جانا پڑتا ہے۔ وہاں ان الفاظ کے لفظی معنوں پر غور کرنے سے ہم پر وہ حقیقت کھل جاتی ہے جو قرآن نے ان کے متعلق بیان کی ہے۔ اب اگر یہ امر واقع کا اظہار ہے۔ تو پھر آج بھی یہ کس زبان کو حق پہنچتا ہے۔ کہ اس فقرہ میں انا انزلناہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون (قرآن عربی اس لئے نازل ہوا کہ اس سے مقاصد جلدی سمجھ میں آتے ہیں) اگر لفظ عربی کی جگہ اسے رکھ دیا جائے تو یہ فقرہ صحیح ہو۔

یہ امر ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ کہ جس زمانہ میں کل قومیں جمع ہو جائیں تو مذہب بھی عالمگیر ہونا چاہیئے۔ پرورش جسم کے لئے آج ہمارے دسترخوان حسب استطاعت دنیا زمانہ کی چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں غربا تک کی خوراک میں اس وقت دوسرے ممالک کی چیزیں بھی عام طور پر آگئی ہیں۔ مثلاً آلو۔ گوبھی ادویات میں کنین کا بھی حال ہے۔ ہر فرد بشر انہیں استعمال کر رہا ہے۔ بہرحال ایک شریف آدمی کے

دستر خوان پر اگر جسمی پرورش کیلئے مختلف ممالک کی اشیاء کا ہونا اس وقت ضروری سمجھا گیا ہے تو کیوں رُوحانی پرورش کے لئے جو دستر خوان مذہب سمجھا ہے اسمیں مذاہب عالم کی تعلیمات نہ آجائیں ایک تو انسان کو طبعاً اپنے آبائی طریقوں سے تعلق ہوتا ہے۔ دوسرا کل کے کُل قدیمی مذاہب خدا کی طرف سے ہی تھے۔ اس لئے وہی کتاب دُنیا کو عالمگیر مذہب دے سکتی ہے۔ جس میں وید۔ ژندواوستا انجیل۔ توریت۔ زبور۔ وصایائے سُقراط۔ لقمان کانفیوشش۔ تعلیمات بُدھ۔ کرشن۔ رامچندر اپنی اصل شکل میں جمع ہوں۔ قرآن نے ایسا ہونے کا دعوے کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے صحفًا مطھرۃً فیھا کتب قیمۃ یعنی قرآن کُل صحائف کو اپنے اندر لئے ہُوئے ہے۔ اس لئے ان کی تعلیمات کو ان آلائشوں سے پاک کر لیا ہے۔ جو انسان کے ہاتھ نے ان میں ملا دی تھیں۔ دُنیا کی کسی اَور کتاب میں بھی کوئی ایسی تعلیم نہیں۔ کہ اگر وہ صحیح ہو تو وہ قرآن میں نہ ہو۔ عالمگیر مذہب کیلئے کتاب تو ایسی ہی ہونی چاہئے۔ جس کا قرآن مُدعی ہے۔ اور جسنے

سے علے وجہ البصیرۃ قرآن کریم کے اس دعوے کو سچا ہی پایا ہے۔ لیکن اس کی تفسیر اس کتاب کے حدود میں نہیں آسکتی۔ ہمنے تو اس کتاب میں صرف اسی قدر دکھلاتا ہے کہ الہامات سابقہ کی موجودگی میں کیوں قرآن کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اُن میں سے یہ بھی ایک ضرورت تھی۔ کہ قرآن سے پہلے کوئی بھی کتاب مذکورہ بالا معنوں میں عالمگیر کتاب نہ تھی

اب میں چند سطور میں قرآن کریم کے ایک خاص امتیازی نشان کو لکھ کر اس کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے الہام آتا ہے۔ اس مقصد کو آج قرآن کے سوا کوئی اور کتاب پورا نہیں کرتی۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح انسانی جسم میں طرح طرح کی قوتیں مخفی ہیں۔ مثلاً درخت پر چڑھنا۔ پانی میں تیرنا۔ قسم قسم کی ورزشیں کرنا۔ رفتار میں گھوڑے سے سبقت لیجانا۔ بڑے سے بڑا وزن اُٹھا لینا اعلےٰ سے اعلےٰ طاقت کے کرشمے دکھلانا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب کی سب قوتیں تعلیم و تربیت سے ظاہر ہوجاتی ہیں۔ یہی دماغی قویٰ کا بھی حال ہے

اسی طرح نفس انسانی میں بھی عجیب در عجیب قوتیں چھپی ہوئی موجود ہیں جنکو لوگوں نے اخلاق اور روحانیات سے تعبیر کیا ہے۔ ان قوتوں کے نشوونما پانے کی قابلیت مذہب سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے الہام الٰہی کی یہی ایک وجہ بتائی ہے۔ اولٰئك علیٰ ھدًی من ربھم واولٰئك ھم المفلحون۔ یعنی الہام نازل ہوکر ربّ کا وہ راستہ بتا دیتا ہے۔ جس پر چل کر انسان کی پوشیدہ قوتیں باہر آجاتی ہیں۔ فلاح کے لفظی معنے یہی ہیں۔ یعنے کسی چھپی ہوئی چیز کو روشنی میں لے آنا۔ ان آیات میں دو لفظ اور بھی قابل غور ہیں۔ ربّ اور ھدیٰ ربّ اس تربیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے انسانی استعدادات تکمیل پالیں۔ ھدیٰ وہ راہ ہوتی ہے جو آخری مقام مقصود تک پہنچائے۔ اب نفس انسانی کی پہلی حالت جذبات حیوانیہ کا مجموعہ ہے۔ حرص۔ لالچ۔ غصہ۔ کینہ شہوت۔ محبّت۔ عشق۔ رحم۔ ظلم۔ تہوّر۔ بزدلی صدق۔ کذب۔ حسد۔ غیبت۔ منافقت۔ حلم۔

قیام - تلون +

الغرض نفس انسانی مجموعۂ اضداد ہے - اور تہذیب نفس جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں - ان ہی چیزوں کی تادیب و تعدیل سے تعلق رکھتی ہے - یہی چیزیں جن کا نام بعض شکلوں میں کج خلقیاں - بدمعاشیاں - شرارتیں رکھ دیا جاتا ہے - صحیح مواقع پر استعمال ہونے سے اخلاق فاضلہ اور حسنات بن جاتی ہیں - مثلاً کسی مفید چیز کے حاصل کرنے کی ہم میں طبعاً خواہش ہے - اسی کا نام ضرورت اور اس کا نام لالچ ہے - ہمارا دل کسی چیز کی طرف کھینچا جاتا ہے اسی کو محبّت - الفت - شفقت - عشق شغف کہتے ہیں - جو مختلف حالات کے لحاظ سے مذموم محمود ہوسکتا ہے - الغرض نفس انسانی میں جذبات کا ایک خزانہ ہے - اس کا مناسب استعمال اخلاق اور اس کی بد استعمالی کج خلقی کے نام سے منسوب ہوتی ہے - مذہب کا یہی کام ہے - اور الہام دنیا میں اسی لئے آیا ہے - ونفس وما سوّیٰہا - یعنی مقصد مذہب یہ ہے کہ نفس کو تعدیل کی کٹھالی میں

سے نکال کر تکمیل تک پہنچا دے ۔ ہمارے نزدیک کسی مذہب یا کسی کتاب کے کامل ہونے کا بھی معیار یہی ہے ۔ اور اگر میں یہ کہتا ہوں کہ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے ۔ جو اس معیار پر قائم رہ سکتی ہے ۔ تو نفس الامر کا اظہار ہے آج مذہبی اشغال میں ہمیں تیس سال گذر گئے مختلف مذاہب کی کتابیں محبت اور عزت سے پڑھیں ۔ کیونکہ میں نے انہیں اصل شکل میں خدا کی طرف سے ہی سمجھا ۔ بزرگان ملت وغیرہ کے وصایا کو پوری عزت و تکریم سے پڑھا اور اُن پر غور کیا ۔ مجھے یہ ہی بات نظر آئی ۔ کہ یہ کتابیں اور یہ بزرگ تو ضرور من جانب اللہ تھے لیکن ان کی تعلیمات انسانی دستبرد سے نہ بچیں اس لئے مخلوط ہو جانے کے باعث اُنکی تعلیمات اگر ایک طرف نامکمل ہیں ۔ تو دوسری طرف اعتدال سے بھی کہیں کہیں ادھر ادھر ہو جاتی ہیں ۔ اس کے ذمہ وار وہ بزرگ نہیں ۔ بلکہ بعض متاخرین انسانوں کی غلط کاری جیسا کہ قرآن نے آیاتِ زیر بحث میں اشارہ کیا ہے ۔ پھر اس بات

کو بھی چھوڑ دو۔ ہم نے جو معیار بالا پیش کیا۔ اسی کو لیلو۔ اگر تو کل انسانی جذبات کی اور انکی مختلف شکلوں کی تہذیب و تعدیل کا علاج اِن کتابوں میں موجود ہے۔ تو پھر قرآن کریم کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر وہ ان باتوں سے خالی ہیں تو پھر اس نقص کی تکمیل کسی اور کتاب کے ذریعہ ہونی چاہئیے۔ جس کے لانے والے کا آخری الہام تو یل کے الفاظ میں ہو۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ ترجمہ۔ آج ہم نے تمہارے دین کی تکمیل کردی۔ اور اتمام نعمت کر دیا ہے اور تمہارے لئے جو دین پسند کیا ہے۔ وہ اسلام ہے یعنے قوانین پر چلنا +

اپنی فطرت کے مطابق ایک مذہب کی تمہیں ضرورت تھی۔ ہم نے تمہاری فطرت اسی قسم کی بنا رکھی ہے۔ کہ وہ مقررہ راہ پر چلکر اپنے جوہر ظاہر کر دیتی ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا ذلک دین القیمہ۔ یہ فطرت تمہیں ہمنے (اللہ نے) دی ہے۔ اور یہ وہ ہے جس پر ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے

یعنی تمہاری استعدادیں روشن ہو جاتی ہیں اگر تم صحیح راہ پر چلو بالفاظ دیگر قانون مقررہ پر چلنا اور اطاعت قانون میں امور مطلوبہ کا حاصل کرنا تمہاری فطرت ہے۔ اور یہی مضبوط دین تمہارا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم نے دین اسلام تمہارے لئے پسند کیا۔ یعنی قوانین کی اطاعت اس امر کیلئے تم قوانین کے محتاج تھے۔ جو مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے۔ انہیں بعض وقت تم نے بھلا دیا۔ بعض وقت اپنے آمیزشوں سے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ ہمارے نزدیک باطل ہو گئے اس لئے ہمیں ان کے قائمقام ایک اور قانون بھیجنا پڑا۔ او ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (جب کوئی ہماری آیت بھول جائے یا انسانی دست برد سے قابل استعمال نہ رہے۔ یعنی منسوخ شدہ اور باطل ہو جائے۔ تو ہم اس کے قائمقام وہی چیز لے آتے ہیں یا اس سے بہتر چیز لے آتے ہیں) تم اپنے ارد گرد صحیفہ قدرت کا مطالعہ کرلو۔ جب کبھی کوئی ایسی چیز جس سے تمہارا فائدہ وابستہ ہو گم ہو جائے۔ یا

قابل استعمال نہ رہے - تو ہم اس کے قائمقام ضرور دوسری چیز بھیجدیتے ہیں - بلکہ بعض وقت اس سے بہتر چیز پیدا کرتے ہیں - اب اگر یہ صحیح اصول ہے - تو کُل دُنیا کی کتب مقدسہ کو دیکھ لو وہ یا تو دنیا سے مٹ چکی ہیں - یا اگر مٹی نہیں تو سخت ناقابل فہم ہونے کے باعث اپنے مطالب اور وصایا کو ویدکی طرح انسانی حافظہ سے بھلا چکی ہیں یا مخلوط ہوجانے کے باعث قابل نسخ ہوگئی ہیں - تم صحیفہ قدرت کے قاعدہ مذکورہ بالا کو سامنے رکھکر خود بھی فیصلہ کرو - کہ آیا ہم پہلی کتابوں جیسی یا اُس سے بہتر کوئی کتاب بھیجتے یا نہ بھیجتے +

کس قدر حیرت کا مقام ہے - کہ انسان اپنے جسم کی پرورش کیلئے ہمیشہ وہی چیز پسند کرتا ہے جو طبعی حالت میں ہو - اور انسان کے ہاتھ کو کم لگی ہو - آج بازار میں وہی دُودھ کے ڈبے زیادہ قیمت پاتے ہیں - جن کے متعلق یہ اشتہار دیا جاتا ہے - کہ اسمیں کا دُودھ مشین سے دوہا گیا - مشین سے ڈبوں میں بند ہؤا - یعنے گائے کے تھنوں سے چل کر دسترخوان پر آنے تک کسی مرحلے پر انسان

کا ہاتھ اس دودھ کو نہیں لگا۔ انسانی ہاتھ کی
آلائش سے بچ جانے کی جو خوبی اس دودھ میں
ہے۔ وہی اس کی سفارش ہے۔ اسی طرح ایک
پانی کا گلاس پینے کے قابل نہیں سمجھا جاتا جس میں
کوئی شخص اپنی انگلیاں ڈبو دے دیگر انسانی
ہاتھ چھوڑ ہمیں اپنے ہاتھوں سے اس قدر نفرت
ہو گئی ہوئی ہے۔ کہ جو چیز ہمارے اکل و شرب
میں آتی ہے۔ وہ بھی ہم ہاتھ سے نہیں چھوتے
چھری کانٹے۔ چمچہ۔ اسی وجہ سے استعمال میں
آرہے ہیں۔ بیکٹ پانوجی سے پیدا ہوکر اور
مصیبت پیدا کر دی ہے۔ الغرض جسم کی صحت
اسی بات پر منحصر ہے۔ کہ جو چیز ہم کھائیں اور
پیئیں وہ ہ چھوت سے بچی ہوئی ہو۔ لیکن
انسان کس قدر متضاد العمل واقع ہوا ہے۔ جسم
کے لئے تو اس قدر تنازعہ اور جھگڑا اور روح
جیسی قیمتی چیز کی پرورش کیلئے جو مواد اس کے
سامنے ہے۔ اس میں اسے انسانی دستبرد کی ذرا
بھی پروا نہیں۔ قرآن کے سوا آج کونسی کتاب
ہے جسے انسانی ہاتھ نے تباہ نہیں کیا ایک پانی کے

گلاس پینے میں جس میں نوکر کی ایک اُنگلی کا حصہ لگ گیا ہو تمہیں اس قدر نفرت ہے۔ لیکن جسے تم جام ہدایت سمجھ کر غٹا غٹ پی رہے ہو۔ اس میں وقتاً فوقتاً انسانی ہاتھ پڑا ہُوا ہے۔ اور اسبات کا تمہیں علم بھی ہے۔ آج سے پچّاس ساٹھ برس پہلے قرآن انسانی کتاب سمجھا گیا۔ کہ اس نے توریت۔ انجیل اور دیگر کتب مقدّسہ کو محرف اور دست مالیدۂ انسان قرار دیا۔ پادریوں نے یہ بھی کہا۔ کہ قرآن کے منجانب اللہ نہ ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے۔ کہ وہ توریت۔ انجیل کو محرف کہتا ہے۔ آج تو یہ امر طے ہو گیا۔ آج پادریوں نے بھی تسلیم کر لیا۔ کہ یہ کتاب محرف و مبدّل ہیں۔ اب اگر قرآن کے بیان پر تحقیق جدید نے مُہرِ صداقت لگا دی۔ تو جس منطق پر اسے انسانی کتاب سمجھا گیا تھا۔ اس کے عکس سے اسکو ربّانی کتاب کیوں نہ سمجھا جائے لیکن تعصّب اور ضدّ کی کوئی حد ہے۔ کہ یہ لوگ اپنی ہدایت کے لئے انجیل اور توریت کو ہی دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ اگر قرآن کی طرف نہ آتے تو خیر ایک حد تک یہ امر صحیح ہوتا۔ کیونکہ اجنبیّت ہی ایک بھاری روک ہوتی ہے

لیکن جب ان پر توریت انجیل کا محرف ہونا ثابت ہوچکا تھا تو ان پر دو باتیں لازم تھیں۔ اول یہ کہ توریت و انجیل کو ہاتھ نہ لگاتے۔ اور دوسرا یہ کہ اس کے قائمقام کسی خدا کی کتاب کی تلاش کرتے اور کم از کم اس کتاب پر غور کرتے جس نے تیرہ سو برس ہوئے ان کی کتابوں کو محرف بتلایا +

آج چار پانچسو برس سے اوپر ہوچکا۔ جب جیمس اوّل شاہ انگلستان کے زمانہ میں اور اس کے حکم سے اوّل اوّل بائیبل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ کل پرانے مسوّدات جمع کئے گئے دیکھے گئے تحقیق کئے گئے۔ جس پر انجیل مرقس کے آخری باب کی آخری گیارہ آیات مسلمۃ الحاقی ثابت ہوئیں۔ یعنے پُرانے سے پُرانے یونانی نسخوں میں جس کا ترجمہ باقی نسخہ جات ہیں۔ اور وہ نسخے آج بھی یوپ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان آیات کا پتہ نہیں ملتا۔ کیا وہ آیات اسبات کی ذمہ وار ہیں۔ کہ مسیحی مذہب دوسری قوموں تک پھیلایا جائے۔ ورنہ خود مسیح اپنے وقت میں یہی کہتا رہا کہ میرا مذہب میری

اپنی قوم کیلئے ہے دُنیا کی کسی قوم کیلئے نہیں۔ اس کے علاوہ ان ہی آیات میں یہ تعلیم ہے۔ کہ انسان کی نجات کیلئے مسیح پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ آیات مسلمۃ الحاقی ہیں۔ چنانچہ جیمس کے زمانہ مترجمین نے اِن گیارہ آیات کے محاذ میں حاشیہ دیدیا کہ قدیمی نسخہ جات میں یہ آیات موجود نہیں یعنی یہ الحاقی ہیں۔ اب ان لوگوں کا کیا حق ہے کہ دوسری قوموں میں عیسائی مذہب کو پھیلائیں یا ایمان بر مسیح کو ہر ایک کیلئے ضروری سمجھیں۔ یہ مسیح کی تعلیم و عمل کے خلاف ہے۔ اور جن آیات کے بنا یہ امُور قائم ہُوئے ہیں۔ وہ مُسلمۃ الحاقی ہیں۔ اسطرح چاروں انجیلوں کو پڑھ لیں تثلیث کا نام تک نہیں نہ پاؤگے۔ صرف انجیل یوحنا میں ایک آیت ہے۔ جسمیں یہ ذکر ہے۔ کہ آسمان پر تین ہی نام ہیں۔ باپ۔ بیٹا۔ رُوحُ القدس۔ اس آیت کے حاشیہ پر بھی وہی مترجمین لکھتے ہیں کہ یہ الحاقی ہے۔ اور پُرانے نسخوں میں موجود نہیں۔ اگر یہ لوگ امین ہیں تو اس آیت کو اور ایسا ہی مرقس کی آخری دس گیارہ آیات کو انجیل سے نکال ڈالیں۔ پھر باپ۔ بیٹا

رُوح القُدس کا تنازعہ ہی دُنیا سے مٹ جاتا ہے
اور غیر ممالک کے مشن ہی ختم ہو جاتے ہیں - اور دُنیا
اُن کے وجُود سے جس پولیٹیکل مصیبت میں
پڑ گئی - آئندہ اس سے بھی نجات ہو سکتی ہے -
کیا اسی کا نام امانت و دیانت ہے - کہ کروڑ در
کروڑ کاپیاں انجیل کی شائع ہوں - اور ان میں
یہ الحاقی آیتیں رکھی جائیں - اور پھر اس پر یہ
ظلم کہ جو حاشیہ اُن مذکورہ بالا مترجمین اوّل نے
اپنے ترجمہ میں ان آیات پر دیا تھا وہ اڑا دیا جائے +
حیرت کا مقام ہے کہ آج کسی جوڈیشل عدالت
میں اگر کوئی ایسی دستاویز پیش کیجائے جس پر مُدّعی کی
حقیت کا حصر ہو - اور اس دستاویز کی ایک
آدھ سطر جعلی ثابت ہو جائے تو وہ کل کا کل دستاویز
مسترد ثابت ہو جاتا ہے - ان لوگوں کے ہاتھ میں
دو ہزار برس سے دستاویز ہے - جس کے بعض حصص
کے جعلی ہونے کا علم اُن کے اعلےٰ معلمین کو مُدت
سے ہے - اور جسے انگریزی مترجمین نے چار پانچسو برس
ہُوئے طشت از بام کر دیا - پھر یہ لوگ اسی کتاب سے
تمسک کرتے ہیں - اور اس کتاب کے ثبوت پر مجرمانہ

پردہ ڈالتے ہیں - ان کی امانتوں کا اگر یہ حال ہے تو پھر اُن سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے - مذہب تو امانت و دیانت سکھلانے آتا ہے +

انسان اپنی فلاح و ہدایت کیلئے تو ایک مکمل دستور العمل کا محتاج تھا - اس کی فطرت جیسا کہ میں نے خود اوپر بیان کیا ہے قانون چاہتی تھی - قانون وقتاً فوقتاً آیا - انسان کبھی اُسے بھول گیا کبھی وہ باطل ہو گیا - آخر خدا تعالیٰ نے اُسے قرآن کی شکل میں نازل فرمایا - جو کچھ بھی انسانی قواء کی نشو ونما کے لئے ضروری تھا - وہ اسمیں جمع کر دیا گیا جس کے متعلق ہمیں یہ خوشخبری دی - الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا + بقلم محمد ضمیر الدین فاروقی

ہوٹل کیپلیون لطادیہ
ملک جاوہ مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۲۱ء

ملتجی دعا
خواجہ کمال الدین مسلم مشنری